وحی
صفدر سرمدی
مکتبہ واجد
بلاک نمبر ۳ بھلوال ـــــ ضلع سرگودھا

نام کتاب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وحی
مصنف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ صفدر سرمدی
طبع اول ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۷۰ء
تعداد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۱۰۰
ناشر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مکتبہ واجد بھلوال (سرگودھا)
کتابت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ محمد انور خوشنویس بھلوال
قیمت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۰ روپے
مطبع ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نثار آرٹ پریس لاہور

فہرست ابواب

اُو در بغلِ من است و من در طلبش
دزدے عجبے برہنہ کرداست مرا

ملا گوید بر فلک شد احمد
سرمد گوید فلک بہ احمد در شد

تعارف

حیاتِ آدم کا ماضی اور حال اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ کہ عقل کے بھروسہ پہ قائم کیئے گئے نظریاتِ زندگی باوجود قابلِ تحسین مادّی ارتقاء کے انسان کو امن اور سلامتی مہیا نہیں کر سکے۔ بلکہ اس کے برعکس ایک عالمگیر انتشار اور داخلی ہیجان کے پنپنے کیلیئے سازگار ماحول فراہم کرتے چلے آرہے ہیں۔ جس کے سبب انسانیت زندگی کی باطل راہ اختیار کرتے ہوئے اپنی اصلیت اور صحیح نصب العین کو فراموش کرکے فساد، آلودگیوں اور تباہ کاریوں کے طوفانوں میں گھر چکی ہے اور اُسے نجات کا راستہ بتانے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر کسی حق شناس دل دردمند کی آواز کبھی اُٹھتی بھی ہے تو شیطانی قوتوں کی غالب اکثریت کے شور و شر میں دب کر رہ جاتی ہے۔

خاک کے ذروں سے مایوس ہو کر نگاہِ حق بین افلاک کی طرف اُٹھتی ہے تو اشارہ یہی ملتا ہے۔ کہ انسانیت کی نجات کا ذریعہ وحیٔ نبوّت کو نظریۂ حیات تسلیم کرکے اس پر عمل پیرا ہونے کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ (۲/۴) فسادِ زندگی کو دور کرکے اس میں اصلاح و حُسن پیدا کرنے کا ذریعہ اس کے سوا اور کوئی ممکن نہیں ہے۔

پھر شکایت منکرینِ وحی سے کیوں ہو۔ جو عقل کے فریب میں گرفتار ہیں؟ ابصد افسوس گلہ اُن سے کرنا واجب ہے۔ جو وحی کے علمبردار بنے بیٹھے ہیں لیکن پسماندہ اور

ذلیل وخوار ہیں۔ ایسے لوگ راہبرِ انسانیّت کیونکر ہو سکتے ہیں؟

دراصل نزولِ وحی کے آغاز سے ہے کہ ختمِ نبوّت اور اُس کے بعد آج تک عقل و عشق کے مابین ہمنوائی کے لیے کشمکش جاری ہے۔ انسانیّت کی تاریخ میں وہ لمحات نہایت قلیل دکھائی دیتے ہیں۔ جو دونوں نے مل کر گزارے ہوں۔ ورنہ اکثر و بیشتر عقل نے سرکش ہو کر عشق کو پامال کیا ہے۔ عشق عقل کو آتشِ نمرود سرد کرنے کے سبق دیتی ہے۔ عقل محوِ تماشائے لبِ بام رہتی ہے۔ عشق حقیقت ہے عقل اس کو پہچاننے کا ذریعہ ہے۔ رازِ حقیقت عشق عیاں کرتا ہے۔ اور عقل کے تعاون سے پیکرِ خاکی پر نورِ حقیقت آشکار کر کے اُسے اپنی حقیقت کی طرف لوٹانا چاہتا ہے۔ لیکن عقل جذبات کے فریب میں آ کر عشق سے وفا نہیں کرتی۔ عشق قوّتِ لامحدود ہے۔ عقل محدود توانائی ہے۔ عشق تنہا دیوانگی عقل تنہا آوارگی! دونوں ہمنوا ہو کر سفرِ حیات طے کرنے پر رضامند نہ ہوں۔ تو دنیا پاگلخانہ ہے۔ اور اگر ایک ساتھ چلیں۔ تو زمین جنّت ہے۔ عشق عقل کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے لیکن عقل اُس سے مفاد تو اُٹھا لیتی ہے۔ وفا نہیں کرتی۔ عشق قوّتِ رُوحانی ہے۔ عقل مادّی توانائی ہے۔ زندگی رُوح اور مادّے کے مخلوط توازن بدوشِ علم و عمل کا نام ہے۔ الگ رہیں۔ تو بِلا مقصد اور بے کیف ہے!

وحی پر ایمان کا دعویٰ کرنے والے پسماندہ و معذور ہیں۔ ترقی یافتہ منکرینِ وحی خود ساختہ مذاہب اور اُن کے خداؤں سے بیزار ہو کر دہریّت کا راستہ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ زمین پر مثال پیش کرنے کے لئے کوئی خطہ وحی کی حکمرانی کے نقش و نگار دکھانے والا موجود نہیں ہے۔ چار سُو سناٹے میں طوفانِ شر کی لرزہ خیز آوازوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ کہیں کفر کا غلبہ ہے اور کہیں شرک رواں ہے۔ شیطان زمین پر پوری طرح مُسلّط ہے اور انسانیت بڑی تیزی کے ساتھ بھیانک تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ باطل سے باطل برسرِ پیکار ہے جس کا نتیجہ بنی نوعِ انسان کی مکمل بربادی کی صورت میں دکھائی دے رہا

ہے۔ افسوس! کہ اس "قیامت" سے انسانیت کو بچانے والا کوئی گروہِ آدم موجود نہیں ہے۔

انسانیت کی راہبری اور زمین پر امن اور سلامتی قائم رکھنے کی ذمہ داری وحی کے علمبرداروں پر عائد ہوتی ہے۔ زندگی کو فساد سے بچا کر اس میں اِصلاح وحُسن پیدا کرنا اُن کا بنیادی فریضہ ہے۔ اُن کا عظیم مقصد ایک ایسا عالمگیر معاشرہ قائم کرنا ہے جس میں ہر فرد کے لیے عرفانِ حق حاصل کرنے کے مواقع مُیَسّر ہوں جو حیاتِ انسانی کا صحیح نصب العین ہے۔ وحی کی تعلیم میں پوشیدہ عظمتِ آدم معلوم کر کے وحی پر ایمان کے دعویداروں کی پستی دیکھ کر عقل محوِ حیرت ہے کہ ہونا کیا چاہیئے تھا اور ہُوا کیا ہے؟

بسوخت عقل زِ حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست!

ارشاد ہے "وحی تمام بنی نوع انسان کے لیے اظہارِ حقیقت ہے۔ اور جو لوگ اس کو بطورِ ہدایت و نصیحت قبول کر لیں۔ اگر اُن کا ایمان و عمل قرآن کی تعلیم کے مطابق ہو گا۔ تو وہ یقیناً زمین پر مُسلّط ہوں گے۔" ($\frac{۳}{۱۳۸ - ۱۳۹}$) "اور تسلّط قائم رکھنے کے لیے ہر لحاظ سے غالب قُوّت فراہم کر کے رکھیں گے تاکہ اُن کی ہیبت بیٹھی رہے اور کوئی شیطانی قوّت سرتابی نہ کر سکے۔" ($\frac{۸}{۶۰}$) مسلمانوں کو اپنی حالت کا جائزہ لے کر اپنے ایمان و عمل پر نظرِ ثانی کی ضرورت درپیش ہے!

اُمّتِ مسلمہ کو اس کے زوال پذیر ہونے کے زمانہ سے لے کر آج تک دانشور بندگانِ خُدا نے زورِ قلم سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی ہے لیکن اس کی بے حسی اور غفلت بدستور قائم ہے۔ بلکہ اس کے زوال میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

اللہ کے شیدائیوں نے جس طرح قرآن کو سمجھا اور جس نیک نیتی کے ساتھ اُمّت کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کے برحق ہونے میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن اُن کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہُوا کہ یہ عام فہم نہیں ہیں اور اُن

کو اہلِ علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مُدّتِ دراز سے رُو بہ زوال ہونے کے سبب مُسلمانوں کی بھاری اکثریت چونکہ بے علم یا کم علم ہے اس لیئے اُن سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتی۔

آفتاب کی روشنی سے ستارے منوّر نہ ہوں تو مہتاب تاریکی میں تنہا درخشندہ نشان ہے۔ جو باعثِ زینتِ آسماں نہیں ہو سکتا۔ زمین نورِ خداوندی سے اسی صورت جگمگا سکتی ہے۔ کہ ساری مخلوق کے دل وحی کی تعلیم سے روشن ہو جائیں۔ اس خیال کو جب چند آیات نے تقویّت دی کہ قرآن سمجھنے کے لیئے آسان ہے۔ ($\frac{۵۴}{۳۲}$) واضح اور صاف ہدایت ہے۔ ($\frac{۳۶}{۶۹}$) اس میں تفاوت نہیں ($\frac{۴}{۸۲}$-) اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ($\frac{۱۸}{۱}$) تو آرزُو پیدا ہوئی کہ کیوں نہ وحی کی تعلیم کو سادہ ذہن اور سادہ دل لوگوں کے سامنے سادگی کے ساتھ بیان کیا جائے جو بآسانی ان کی سمجھ میں آسکے۔ اور شاید کہ اس طرح مقصد حاصل ہو جائے۔

مَیں دانشوروں میں سے نہیں ہُوں لیکن اُن سے کچھ نہ کچھ حاصل ضرور کیا ہے۔ جس کے سبب منتشر گمراہ انسانیّت کو اپنی حقیقت سے ناآشنا. فساد اور آلودگیوں میں ملوث آوارہ و رُسوا دیکھ کر وحدتِ انسانیّت کا احساس بیدار ہوا تو خاموش رہنا گوارہ نہ ہُوا اس لیئے قلم اُٹھانے کی جسارت کر لی۔ حق سے غافل انسان کہیں مادیّت میں کھو گیا ہے۔ اور کہیں مذہب کی فریب کاریوں سے مسحور ہے۔ زندگی کے اعلیٰ نصب العین کے پیشِ نظر آرزُو یہ ہے۔ کہ خاک و رُوح ایک دُوسرے میں پیوست ہو کر ہم سفر ہو جائیں۔

رُوح اور مادّے کا مُجسّمہ وحی سے بغاوت کر کے ستاروں پہ کمند ڈال کر یہ سمجھے کہ اس نے ارتقائے انسانیّت کی بڑی اہم منزل عبور کر لی ہے تو یہ اسکی خوش فہمی ہے۔ اگر وحی کو تسلیم کر کے مادّی دنیا سے رُخ پھیر کر گوشہ نشینی میں لذّتِ نفس سے مخمور ہو کر یہ محسوس کرے کہ وُہ روحانی منزلیں طے کرتا ہُوا روحِ مطلق کے قریب ہو رہا

اشارہ موجود ہے۔ ارشاد ہے۔ "ہم نے قرآن کو عربی میں نازل کیا تاکہ تم سمجھو۔ (۴۳/۳)
قرآن عربی میں نازل ہوا تاکہ شہر میں اور اس کے اردگرد بسنے والوں کو (حق کا راستہ
دکھائے) (۴۲/۷) واضح معانی والی کتاب عربی میں ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو سمجھ
رکھتے ہیں۔ (۴۱/۳) اور اسی اشارہ کے تحت تمام دیگر کتب متعلقہ دین کو بھی اپنی ہی
زبان سے سمجھنا چاہئیے۔ دوسروں کے مطالعہ اور غور و فکر کی تقلید کرنے سے ذہنوں
میں جمود واقع ہو جاتا ہے۔ اور اکثر مقلدین کا تعلق، رجوع اور محبت پرستش کی حد تک
اُن شخصیات سے ہو جاتی ہے جن کی وہ تقلید کرتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ تفرقہ و انتشار
ہوتا ہے۔ اور یہ شرک کی علامت ہے جسے ہم آزما رہے ہیں۔

سب کو معلوم ہے کہ دنیوی علوم حاصل کرنے کے لئے اُن کی زبانوں کو دوسری
تیسری ... ہے۔ اور ان علوم کو حاصل کرنے کے دروازے سب پر کھلے ہیں جس سے
سب انسان مادی لحاظ سے ارتقا پذیر ہیں۔ اس کے برعکس علوم حقیقت الٰہیہ یعنی
دین کا علم حاصل کرنے اور اس پر غور و فکر کرنے کے دروازے چند لوگوں نے مقفل
کر رکھے ہیں۔ اور یہ اُمتِ مسلمہ کی پسماندگی، اختلاف و تفرقہ اور انتشار کا ایک بنیادی
سبب ہے۔ اس سبب کے اصل سبب کو معلوم کرنے کے لئے دین اور مذہب میں
فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔

نوعِ انسان کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ہمیشہ ایک مکمل نظریۂ حیات
ملتی رہی ہے جسے دینِ اسلام کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اور آج مکمل ترین نظریۂ حیات
جس میں تا قیامت تقاضوں کا حل موجود ہے بصورت قرآن ہمارے پاس بحفاظت موجود
ہے۔ قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے منکشف ہوتا ہے کہ لوگوں نے اکثر ادوار میں دین سے
انکار کرکے راہِ کفر اختیار کی ہے۔ یا اس میں رد و بدل کرکے شرک کا راستہ اختیار کیا ہے
دینِ حق کی انسان کے ہاتھوں مسخ شدہ صورت کو مذہب کا نام دیا جا سکتا ہے۔

اس اقتدار کا تحفظ کس طرح کرسکتے ہیں، جو وحدتِ امت سے محروم ہیں وہ وحدتِ انسانیت جیسے نیرو مقصد کو کیونکر حاصل کرسکتے ہیں؟ جو بے طاقت و بے قوت و بے سروسامان ہیں وہ خود کو دنیا میں امن اور سلامتی کے ضامن کیوں کہتے ہیں؟

دنیائے اسلام کے ہر فرد سے مخاطب ہوں، ادنیٰ ہو یا اعلیٰ، صاحبِ اقتدار ہو یا مذہبی پیشوا، سب سے میری التجا یہ ہے کہ ہم نے بار ری اٹھا کر صدیاں غفلت اور سرکشی میں گزار دی ہیں۔ قانونِ مکافاتِ عمل کو فراموش کرکے انجام کو نظر انداز کیا ہے۔ آج زندگی فیصلہ کن دور میں داخل ہوچکی ہے۔ خدارا! باطن میں حقیقت کی تلاش کیجئے۔ زبان سے لفظ نہ دہرائیے، حقیقت الٰہی پر حجاب نہ ڈالیے۔ خالق سے مخلوق کا تعلق قائم ہونے دیجئے۔ اس کے سوا زیست نہیں جس کا نام اللہ ہے۔

○

نیند پوری ہوچکی اب کروٹیں لیتا ہے کیوں
مسلمِ خوابیدہ اٹھ قرآن کو [illegible]
اے موحد تیری وہ دیرینہ عظمت کیا ہوئی
پھر ذرا توحید کا پرچم اٹھا میداں میں
دورِ زندگی میں مسلط ہو رہی ہے شیطنت
آدمیت کا فرض ہے تحفظ دینِ خدا

○

اللہ جلّ جلالہٗ

"اللہ ارض و سمٰوٰت کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ روشن ہے جو ایک شیشے کی قندیل ہے۔ قندیل ایک چمکتے ہوئے تارے کی مانند ہے۔ یہ چراغ ایک مقدس تیل سے جلتا ہے جو نہ مشرق میں ہے نہ مغرب میں ہے۔ اور آگ چھوئے بنا جلتا ہے۔ روشنی پر روشنی ہے۔ اللہ اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور اللہ انسانوں کو مثالوں سے سمجھاتا ہے۔ وہ ہر شے کا علم رکھنے والا ہے۔" (۲۴/۳۵)

اس مثال کو ایک اور طرح سے سمجھیں۔ ایک کمرہ ہے جس کے چاروں اطراف چھت اور فرش آئینے ہیں۔ کمرہ روشنی سے منور ہے۔ اس میں متحرک اور جامد اشیاء کا عکس مدمقابل آئینوں میں پڑتا ہوا حد نگاہ سے آگے نکل جاتا ہے۔ اشیاء سے آئینے متاثر نہیں اور نہ آئینے اشیاء پر اثر انداز ہیں۔ اب دیواریں ہٹا کر کسی فضا میں فرش (زمین) اور چھت (آسمان) اور زمین پر متحرک اشیاء (مخلوق) کا تصور ذہن میں لائیں۔ مخلوق رنگ و نور میں ہے لیکن اس کی کوئی حرکت آسمان پر اثر انداز نہیں ہے۔ اور نہ مخلوق پر اثر انداز ہو کر اس کو کسی حرکت پر مجبور کرتا ہے۔ اور نہ مخلوق زمین و آسمان سے الگ ہو کر کہیں جا سکتی ہے۔ (البتہ فکر و شعور کی پرواز زمان و مکان کی حدود و قیود کو عبور کر جاتی ہے۔)

اس مثال سے اللہ کی لامحدودیت کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اور خالق و مخلوق کے باہمی تعلق کی جھلکیاں محسوس کی جا سکتی ہیں اور تقدیر کا نظام سمجھا جا سکتا ہے۔

اور اس سے اللہ کی احدیت ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ سائنس (قدرت) کا یہ تسلیم شدہ اٹل اصول ہے کہ نور (روشنی) ناقابلِ تقسیم ہے۔ اور اس اصول کے تحت کل اور جزو کی غلط فہمی بھی دور ہو جاتی ہے۔ (اس کا تعلق تصوف سے ہے)۔

اللہ نور ہے۔ انسان حاملِ نور ہے۔ (۳۸/۲۴) وحی نور ہے (۱۵۷/۷) انسان وحی کی روشنی میں فکر و عمل سے نورِ باطن کو جگا کر حیاتِ جاوداں کا سفر طے کرتے ہوئے نورِ یزدانی کی جھلکیاں محسوس کر سکتا ہے مگر اس کا ادراک نہیں کر سکتا۔ محدود کے لئے لا محدودیت کا ادراک ممکن نہیں ہے۔

دراصل عرفانِ حق (اللہ) انسانی ذات کا انفرادی تجربہ ہے جو دوسروں کو منتقل نہیں کیا جا سکتا نہ الفاظ میں بیان ہو سکتا ہے۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو انکارِ حق کا کوئی جواز باقی نہ رہ جاتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اللہ کے ہونے اور نہ ہونے پر عقلی دلائل سے بحث آج تک نتیجہ خیز نہیں ہوئی نہ آئندہ ہو سکتی ہے۔ حق کو ثابت کرنے کے لیے صرف عملی دلیل ہی موجب ہو سکتی ہے۔ اور یہی دلیل یہ ہے۔ کہ ایک غیر مرئی مقتدرِ اعلیٰ کا انکار سراسر بے جواز و بے دلیل ہے جب کہ اس کے متبادل کوئی مرئی قادرِ مطلق نظامِ کائنات کو سنبھالے ہوئے نہیں ہے۔ دوسری عملی دلیل یہ ہے۔ کہ ابتدائی تخلیق پر کوئی قادر نہیں ہے تخلیق کی ابتداء کرنے والا فقط اللہ ہے۔ اور وہی اسے دہراتا ہے۔ (۲۷/۶۴ ، ۳۰/۱۱) تخلیق کی ابتداء اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ (۱۰/۳۴)

تخلیق کائنات کی حیرت انگیزیوں سے متاثر ہو کر فلسفی ذہن کی ہر بزن میں خالق اس ــــ اللہ کو چھوڑ کر کچھ تخلیق نہیں کر سکتے بلکہ خود تخلیق کئے جاتے ہیں (۲۹/۶ ــ ۲/۲۵، ۲۰/۱۶، ۳/۳۵) کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ جو زمین و آسمان، سورج، چاند ستارے، معدنیات، نباتات اور حیوانات پیدا کر کے ایک نئی کائنات وجود میں لا سکے؟ اس کا تصور بھی ناممکن ہے۔ اور تیسری عملی دلیل یہ ہے۔ کہ وحی پر ایمان لانے والے ہر شے

فکر و عمل میں وحدت پیدا کر کے قرآنی معاشرہ وجود میں لے آئیں۔ تو معیارِ وحی پر پورا اترنے والے اعلیٰ و ارفع سیرت و کردار کے حامل بندگانِ خدا کا ہجوم زمین پر جنتی زندگی کے نقش و نگار کھینچتا چلا جائے گا۔ اور یہ "اولیاء اللہ" صفاتِ الٰہی کا مظہر بن کر اللہ کے ہونے کا ثبوت بہم پہنچا دیں گے۔ (اس ذیل پر یہ تاریخ شاہد ہے) اللہ نے انسان کو اپنی ذات میں، بحد بشریت، اس کی صفات منعکس کرنے کا جو اشارہ دیا ہے اس کا یہی مفہوم ہے۔ (۲/۱۳۸)

اگر یہ کہہ دیا جائے۔ تو مبالغہ نہ ہوگا کہ لامحدودیت خود کو محدود کر کے اپنی طرف رو بہ سفر ہے۔ بلاشبہ حیاتِ کائنات کی سنجیدگی کا راز موجودہ انسانی زندگی کے مادی حقائق میں مضمر ہے جو محدودیت کی تہہ تر ترجمان ہے۔ اور جس نے زمان و مکان کی قیود میں اپنے اوپر جزا و سزا کی پابندیاں عائد کر لی ہیں۔

ذہن میں یہ خیال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ کو ماننے اور نہ ماننے سے فرق کیا پڑتا ہے؟ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ اس کے لئے وحی کے پیش کردہ لفظ "الٰہ" پر غور کریں۔ الٰہ کے معنی ہیں ایسی ہستی جس کو معبود مانا جائے، جس کی عبودیت اختیار کی جائے، جس کی پناہ مانگی جائے، جس سے دعائیں اور التجائیں کی جائیں، جس کے حکم کی تعمیل کی جائے، جس سے محبت کی جائے اور جس کی پرستش کی جائے۔

الٰہ کے معنی و مفہوم کو سمجھ کر سوچئے۔ کیا کوئی ایسا ہے یا ہو سکتا ہے جس کا الٰہ کوئی نہ ہو؟ کہیں بت الٰہ ہیں، کہیں جمادات، سورج، چاند اور ستارے الٰہ ہیں، کہیں آگ، پانی، گائے اور سانپ وغیرہ الٰہ ہیں، کہیں بارش، آندھی، طوفان دولت، اقتدار، شہوت وغیرہ کے تصوراتی خدا الٰہ ہیں، کبھی عورت الٰہ ہے، کہیں شخصیات الٰہ ہیں۔ دور حاضر میں الٰہوں کا موجد سب سے بڑا الٰہ جذبات ہیں۔ غرضیکہ الٰہ کے بغیر کوئی فرد یا قوم آپ نہ دیکھیں گے۔ انسان فطرتاً الٰہ ماننے

پابند رہنے پر مجبور ہے۔ اگر فطرتِ آدم میں یہ ملکہ ودیعت نہ ہوتا تو الٰہِ حقیقی (اللہ) سے انکار کا جواز پیدا ہو جاتا۔

وحی نے مراد انسانیت کو راہِ راست پر لانے کے لیے جس الٰہِ حقیقی سے متعارف کیا ہے اس کا نام اللہ ہے۔ قرآن میں اللہ کے باقی جتنے نام لیے گئے ہیں وہ تمام اس کی صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور انسان کو اس کی صفات بحدِ بشریت اپنی ذات میں منعکس کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ (۲/۱۳۸) اور یہی انسانی زندگی کا صحیح نصب العین ہے۔

حقیقت سے دانستہ منہ پھیر کر اگر کوئی اللہ کا منکر ہو، یا اس کو عرش پر براجمان مطلق العنان ہستی سمجھے یا اس کو خود میں تلاش کرتا پھرے تو خودی و خدا کی ناآشنائی کا اس سے بڑا کوئی اور ثبوت نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تخلیق اور نظمِ کائنات غور و فکر کرنے والوں کو محوِ حیرت کر دیتا ہے۔ لیکن مقامِ حیرت طالبِ عرفانِ حق کے واسطے قابلِ ذکر مقام نہیں ہے۔ تب کو انوارِ الٰہی کی شعاعیں جبھی روشن کرتی ہیں کہ صفاتِ خداوندی انسان کی سیرت و کردار سے ظاہر ہو کر انسانیت پر اثر انداز ہوں۔ اس کے لیے نفع رساں اور سودمند ثابت ہوں۔ اللہ کے ذاتی اور صفاتی ناموں کو زبان سے دہرا کر عرفانِ حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ معاملہ عشق کا ہے اور عشق ایثار طلب کرتا ہے۔

اللہ جنسِ ارزاں نہیں جو مل جائے۔ طالبِ حق کو لامحدود سفر درپیش ہے۔ منزل معدوم ہے۔ منزلیں ہیں جنھیں وہ ذوقِ جستجو میں عبور کرتا چلا جاتا ہے۔ جب ہر منزل پہ اس کو قریب تر محسوس کرتا ہے۔ تو جنونِ عشق اور بڑھتا ہے اور وہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ اللہ ہی کیا ہے جو مل جائے۔ وہ عشقِ حقیقی نہیں ہے جس میں وصال ہو جائے۔

قرآن میں اللہ کی صفات یا اس کے صفاتی ناموں پر غور کریں۔ اور ان صفات کو بحدِ بشریت اپنانے کی کوشش کریں۔ مثال کے طور پر خالق اللہ کی صفت ہے انسان کو چاہیئے کہ وہ بھی تخلیق کرے۔ اللہ رزق مہیا کرتا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ بھی ضرورت مندوں کو رزق مہیا کرے۔ اللہ پرورش کرنے والا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ بھی دوسروں کی پرورش کرے۔ اللہ رحیم ہے۔ انسان کو بھی باعثِ رحمت بننا چاہیئے۔ اللہ علیم ہے۔ انسان کو بھی علم حاصل کرنا چاہیئے۔ اللہ حکیم ہے۔ انسان کو بھی حکمت سے کام لینا چاہیئے۔ اور اسی طرح اللہ کی وہ صفات جن کا اپنانا انسان کے اختیار میں ہے بحدِ بشریت اپنی ذات میں منعکس کرنے کی کوشش جاری رہنی چاہیئے۔ جتنی اور جس قدر صفاتِ خداوندی کا حامل کوئی شخص ہوگا۔ اتنا ہی اُسے اللہ کا قرب حاصل ہوگا اور یہی حیاتِ انسانی کا صحیح نصب العین ہے۔

جب تک انسان اپنی ذات کا تجزیہ کر کے اس کی حد پر نہ پہنچے وہ حق شناس نہیں ہو سکتا۔ غافل انسان اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت کو محسوس کرتے ہوئے زمین پر اپنی مطلق العنانی کیفیت کی صورت میں خدا کا تصور ڈھال لیتا ہے۔ اور خیال کرتا ہے کہ خدا بھی ایک مطلق العنان ہستی ہے جو تخلیق کر کے آسمان پر بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ صورت کا شیدائی سیرتِ یزدانی سے بیگانہ ہوتا ہے۔ اور اللہ کا یہ تصور ظلم، قہر، اور جہالت کی نسبت ہے۔

مندرجہ ذیل دو آیتوں کے مفہوم کو غور و فکر کے ساتھ سمجھ لیا جائے تو خالق و مخلوق کا باہمی تعلق عیاں ہو جاتا ہے اور اللہ کے بارے میں تمام شکوک و شبہات رفع ہو جاتے ہیں۔ (۱) اللہ نے انسان میں اپنی روح پھونک دی ہے۔ اور ملائکہ (کائنات کی قوتوں) کو اس کے سامنے سجدہ ریز رہنے کا حکم دے رکھا ہے۔ (۱۵/۲۹) (۲) جو بھلائی انسان کو پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ (یعنی انسان میں روحِ خدا سے

کی تخلیق آئینِ فطرت کے مطابق ہوئی۔ نظامِ کائنات اسی کے تحت چل رہا ہے۔ سلسلۂ
حیات آئینِ فطرت کے مطابق جاری رہے گا۔ بعثت اور تنزیل اس سے خارج نہیں
اور وحی آئینِ فطرت ہے۔ یہ سب کچھ تسلیم کر لینے کے بعد اگر انسان وحی اور مادے کو
جداگانہ حیثیت دے یا آئینِ فطرت کا منکر ہو تو یہ اس کی محض ضد ہے جو اُسے
"الٹے بھی لکھنے" سے باز نہیں رکھ سکتی۔

تخلیق

اللہ جب کوئی ارادہ کرتا ہے، تو فرما دیتا ہے "ہو جا" اور وہ ہو جاتا ہے۔ (۳۶/۸۲) انسان کو سمجھانے کے لیے وحی کا یہ طرزِ بیان ہے۔ ورنہ اللہ کا ارادہ کرنا اور فرمانا اس طرح نہیں ہوتا جیسے انسان ارادہ کرتا ہے اور زبان سے اظہار کرتا ہے۔ اس قدرتِ غائب کے ایک اشارۂ ارادی نے پستی اور بلندیوں (زمین و آسمان، ارض و سموات) کو باہم پیوستہ وجود میں لا کر جدا کر دیا۔ (۲۱/۳۰)

زمین پر پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا گیا تاکہ وہ ہلنے نہ پائے۔ اور آسمان اس کے اوپر ایک چھت کی مانند ہو گیا (۲۱/۳۱، ۳۲) جسے سات کروں میں تقسیم کیا گیا (۴۱/۱۲) پھر آسمان پر سورج، چاند اور ستارے تیرتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ (۲۱/۳۳) وقت گزرتا گیا یہاں تک کہ زندگی سے محروم خشک زمین پر آسمان سے پانی (مینہ) برسنے لگا اور وہ سرسبز و شاداب ہو گئی۔ (۲۲/۵) اس طرح پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کی ابتدا کے آثار نمودار ہوئے۔ (۲۱/۳۰، ۲۵/۵۴، ۳/۱۰، ۱۳، ۳۲/۷)

زندگی کی ابتدا آب و گل کے امتزاج سے ایک جرثومہ کی شکل میں ہوئی۔ اور مختلف ذہنیت کے جرثومے سب نباتی اور حیوانی صورتوں میں ظاہر ہو کر پرورش پاتے ہوئے اپنی اپنی شکلوں کو جا پہنچے۔ ان میں نباتاتی شکلیں، گھاس، پودے، بیل، پھول اور درخت وغیرہ (۶/۱۰۰) اور حیوانات جن میں رینگنے والے، دو پاؤں پر چلنے والے، چوپائے، ہوا میں اڑنے والے، پانی میں تیرنے والے اور آدمی سب شامل ہیں۔ (۲۴/۴۵، ۲۱/۳۰، ۲/۲۸، ۱/۱۶)

یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا۔ کائنات کی ابتدائی تخلیق نہایت سائنٹفک درجہ
سے خالقِ اعلیٰ کے بنائے ہوئے آئینِ فطرت کے مطابق مختلف مراحل طے کرتے ہوئے [illegible]
کو پہنچی۔ اگر انسان اعداد و شمار میں معلوم کرنا چاہے تو اس کے لیے تنا یہ جان لینا [illegible]
ہے کہ اس کے ہزاروں سال اللہ کے لمحہ کے برابر ہیں۔ (حقیقت اللہ زمان و مکان
سے بے نیاز ہے)۔

ابتدائی تخلیق کے بعد زندگی کے پھیلنے کا سلسلہ بذریعہ تولید شروع ہوا [illegible]
اور یہ بھی آئینِ فطرت (سائنٹفک طریقے) ہی کے مطابق ہوا۔ زندگی کے خلیۂ واحد میں
جنسی تخلیق کا جوہر پیدا ہوا اور خود بخود۔ نر و مادہ، دو حصوں میں منقسم ہو گیا اور
ہر شے کے جوڑے بن گئے۔ جس کے بعد نباتات اور حیوانات (جن میں مرد و زن [illegible]
ہیں) کثرت کے ساتھ زمین پر پھیلتے چلے گئے۔ (آدمی کو ذہن میں رکھیں جو متعلقہ مضمون
ہے) اختلاط نر و مادہ کے نتیجہ میں رحمِ مادہ کے اندر بصورت نطفہ حمل ٹھہرتا ہے جو رفتہ
رفتہ خون کے ایک لوتھڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور معینہ مدت کے لیے وہاں [illegible]
پرورش پاتا ہے۔ اور وقت معین پر نومولود کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ (۵/۲۲) جنسی [illegible]
سے نسل کشی کی اس طرزِ حیوانی میں تمام حیوانات جبلی طور پر مصروفِ کار ہیں لیکن آدمی اس
میں خود مختار ہے۔

تخلیقِ آدم سے پہلے ملائکہ خلق ہو چکے تھے۔ (۳۰/۲، ۷۱) اور جنات بغیر دھوئیں
کی آگ سے پیدا کیا گیا تھا۔ (۱۵/۲۷، ۲۲) اور ابلیس جنات میں سے تھا۔ (۱۸/۵۰) اور
ان سب کو خالقِ اعلیٰ نے کہہ دیا تھا کہ "میں مٹی سے بشر (آدم) بنانے والا ہوں۔ سو
جب وہ بن سنور جائے۔ اور میں اس میں اپنی روح پھونک دوں۔ تو تم اس کے
سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔ (۲۹/۲۰) "میں زمین کی خلافت اس کے سپرد کرنے والا
ہوں" ملائکہ نے عرض کیا "اے پروردگار! یہ آدم تو زمین میں فساد و خون کرے گا

کیا ہم آپ کی عبودیت کے واسطے موجود نہیں ہیں؟ اللہ نے فرمایا تھا "تم (رازِ حقیقت) نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں" (٢/٣٠)

ظاہر میں حُسن سے آراستہ، باطن میں روحِ خلق سے پیراستہ اور علم و شعور سے مزین آدم جب اپنی مخصوص نمایاں حیثیت میں دیگر مخلوق پر جابر و غالب دکھائی دیا تو ملائکہ اس کے جمال و جلال کے سامنے جھک گئے اور نادم ہو کر پکار اٹھے "اے اللہ! بے شک تو ہی سب سے بڑا علیم و خبیر ہے" لیکن ابلیس نے سرکشی کی اور آدم کے سامنے سر نہ جھکایا۔ (٢/٣١، ٣٣) اللہ نے ابلیس سے پوچھا "تجھے کس بات نے آدم کے سامنے جھکنے سے روکا؟" کہنے لگا "اے خالق! تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے۔ میں اس سے افضل ہوں" اللہ نے فرمایا "سرکشی کرنے والے جنتی زندگی کے قابل نہیں۔ ان کے لیے ذلت و خواری کی (جہنمی زندگی) ہے۔ تو یہاں سے ذلیل اور دور ہو جا" (٧/١٣) ابلیس نے التجا کی "مجھے مہلت دی جائے میں آدم کی حالت میں رہ کر بنی آدم سے استقبال کروں گا اور ان پر اپنی برتری ثابت کر کے دکھاؤں گا۔ مجھے تو دیکھ لے گا میں آدم کو بھی رسوا کر دوں گا" اللہ نے فرمایا "جا تجھے مہلت دی جاتی ہے لیکن جس نے (تیرے فریب میں آ کر) تیری پیروی کی میں ان سب کو (تجھ سمیت) جہنم میں ڈال دوں گا۔" (٧/١٣-١٦)

پھر اللہ آدم سے مخاطب ہوا اور فرمایا "اے آدم! تمہارے اور تمہاری عورت کے لیے جنتی زندگی مخصوص کر دی گئی ہے۔ اس میں رہنے سہنے اور کھانے پینے میں تم آزاد ہو۔ لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ گناہ گار ہو جاؤ گے۔"

ابلیس کو مہلت مل چکی تھی۔ آدم اور اس کی عورت کو بہکانے لگا۔ ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا کہ انہیں اس درخت کے پاس جانے سے اس لیے روکا گیا ہے کہ وہ فرشتے نہ بن جائیں یا انہیں دائمی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔ اور قسمیں کھا کھا کر

اپنی رفاقت اور ہمدردی کا یقین دلاتا۔ بالآخر دونوں ابلیس کے دامِ فریب میں آگئے اور
اس "درخت" کا پھل کھا لیا۔ جونہی عدولِ حکمِ الٰہی ہوئی اُن کی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں
احساسِ شرم و حیا اُبھرا تو درختوں کے پتوں سے اپنی شرمگاہوں کو چھپانے لگے۔ اللہ
نے پکارا۔ اے آدم! کیا تمہیں تنبیہ نہ کر دی گئی تھی کہ ابلیس تمہارا کھلا دشمن ہے! قبولِ
جُرم کرتے ہوئے بخشش کے لئے آہ و زاری ہونے لگی تو اللہ نے فرمایا۔ اے آدم! یہ
حکم کی تعمیل نہ کرنے والے جنتی زندگی سے محروم رہنے والے ہیں۔ اب تمہارے لئے زمین پر
ایک وقتِ معین تک ٹھکانا ہے۔ جہاں تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ اسی میں رہو
گے اور اسی میں مرو گے اور اسی میں سے زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے۔ (۷: ۱۹-۲۵)
اور اس حیاتِ ارضی میں حزن و ملال سے محفوظ رہ کر جنتی زندگی کی طرف لوٹ آنے کا
واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہمارے بھیجے ہوئے پیغمبروں کی وساطت سے تمہیں جو وحی پہنچے
اس پر ایمان لا کر اس کے مطابق زندگی بسر کرو۔ ورنہ تمہارے لئے جہنم کی دنیاوی زندگی
ہے۔ جنتی زندگی سے محروم آدمی محنت و مشقت میں گرفتار ہو گیا!

جنگلوں، صحراؤں اور پہاڑوں میں آدمی کی منتشر زندگی کے دور کا آغاز ہو گیا۔ ہر
پودے، درختوں کے پتے اور پھل، پرندوں، چرندوں اور درندوں کا گوشت اس کی غذا تھی
چرندوں اور درندوں کی کھال اس کا لباس تھا۔ درختوں پر، غاروں میں اور زیرِ زمین
اس کا مکان تھا۔ آزاد فضاؤں میں، نعمتوں کے انبار میں، کبھی بے خوف و خطر کبھی ہراساں
و پُرخطر، کہیں حیوانوں کے ساتھ نبرد آزما، کہیں طوفانِ باد و باراں سے حیران و پریشان، موسم
کے تغیرات کبھی شاداں کبھی لرزاں کبھی شرابور، سورج چاند ستاروں کو حیرت سے تکتا
تھا۔ کبھی سانس پر ہٹ کر سوچتا تھا۔ یہ وجہِ تسکینِ تشنگی تو ہے مگر یوں ساتھ میرے
آزاد قدموں کی جولانی میں در اس کے ورے کیا ہے؟ کوئی منزل آسمان پہ بھی
جاتی تھیں۔ لیکن نگاہ نہ تک میں آدمی ہنوز دورِ حیوانی میں تھا!

یہ زمانہ وہ تھا جب انسانوں کی آبادی بستیوں کی صورت میں زمین کے مختلف حصوں میں آباد ہو چکی تھی۔ اور ایک بستی کی پُرفساد کیفیت دوسری سے مختلف نہ تھی۔ ان تمام بستیوں میں تک ایک سلسلۂ وحی جاری ہوا لیکن ہر بستی کے لوگوں کی اکثریت کفر و شرک سے باز نہ آئی۔ (تفصیل اگلے باب میں آئے گی)

وحی کی روشنی میں اختصار کے ساتھ "تخلیق" کا یہ بیان پیش کیا گیا ہے۔ غور و فکر سے اس کی مفصل تصویر ذہن میں آسکتی ہے۔

خالق اعلیٰ کے بارے میں ایک خیال خام کو جواب دینا ابھی باقی ہے۔ یہ کہ کیا اللہ تخلیق سے پہلے مخلوق کے سوا محدود ثابت نہیں ہوتا؟ یہ خیال کم علمی کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ اللہ ہر نقص سے پاک ہے۔

خلق کرنے کے معنی ہیں "عدم سے وجود میں لانا" اور کسی شے کے وجود میں آنے سے پہلے علم یا خیال یا تصور میں اسکی موجودگی کا "عدم" میں ہونا لازمی ہے۔ اللہ نے خود کو خالق اعلیٰ کہا ہے۔ (۲۳/۱۴) جس سے ظاہر ہے۔ کہ اس کے بعد انسان کو خالقِ ادنیٰ" ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ اور انسان ابتدائی تخلیق سے جو اشیاء بھی خلق کرتا ہے۔ اُن کا ایک تصور یا خیال اس کے ذہن میں پہلے موجود ہوتا ہے۔ اس مثال سے (لامحدود اور محدود میں فرق کو پہچانتے ہوئے) یہ امر ثابت ہے۔ کہ ہر شے وجود میں آنے سے پہلے "عدم" میں موجود ہوتی ہے۔ قرآن نے اس کے لیے "عالم امر" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ (۲/۱۷ ، ۷/۵۴) یعنی اشیاء خلق ہونے سے پہلے عالم امر میں موجود ہوتی ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔

ایک شخص حافظِ قرآن ہے۔ جو قرأت کر رہا ہے۔ دوسرا شخص اسے ضبطِ تحریر میں لا رہا ہے۔ جو الفاظ صفحوں پر محسوس شکل میں سامنے آ رہے ہیں۔ وہ حافظ کے ذہن میں موجود ہیں۔ حتیٰ کہ سارا قرآن مکتوب ہو گیا لیکن حافظ کا ذہن اس سے محروم

نہیں ہو۔ قرآن حافظ کے ذہن میں موجود تھا جو تحریر میں آنے کے باوجود وہاں موجود رہا۔ کائنات عالم میں ابتداء سے موجود ہے اور صفحۂ ہستی پر جس شکل میں آنے کے بعد بھی موجود ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مندرجہ بالا مثال بھی ناقص ہے کیونکہ اللہ بے مثل ہے۔ ورنہ یہ تو انتہائی شرمناک حد تک مضحکہ خیز ہے کہ مخلوق خالق میں نقص تلاش کرنے کی جسارت کرے۔

وحی

کائنات کی ہر شے آئینِ فطرت کے عین مطابق قائم و سرگرمِ عمل ہے۔ کسی چیز کی مجال نہیں کہ وہ اس آئین کی خلاف ورزی کر کے اِدھر اُدھر ہٹ سکے اور نہ کسی کے اختیار میں ہے کہ وہ اس میں رد و بدل کر سکے۔ (۳۵/۴۳) آئینِ فطرت بذریعہ وحی کائنات میں جاری و ساری ہے۔ انسان کے لیے آئینِ فطرت "وحیِ نبوت" ہے لیکن وہ دیگر مخلوق کی طرح اس کا پابند نہیں ہے۔ اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ چاہے تو وحی کو تسلیم کر کے اس کے مطابق زندگی بسر کرے چاہے تو اس سے انکار کر دے۔ (۱۸/۲۹) اور اسی اختیار میں حیاتِ کائنات کا راز پوشیدہ ہے۔

توازن بدوش رعنائیوں کے ساتھ رواں دواں کاروانِ حیات میں سے ایک لمحہ کے لیے آدم زاد کو منفی کر کے اس کا تصور ذہن میں لائیے۔ حیرت و لطف سے سکتہ طاری ہو جائے گا۔ جونہی انسان کی مداخلت سامنے آئے گی زندگی آلودۂ فساد دکھائی دینے لگے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان زندگی کے حسن میں نت نئے اضافے کرتا ہے لیکن جو فساد اس کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے وہ اس قدر کثیر و غالب ہے کہ جیسے کوئی حسین چہرے کو حسین تر بنا کر اسے داغوں کی بدنمائی سے تمام کر دے۔ عشق میں سوز بھی ہے ساز بھی ہے۔

انسان زندگی میں تناسب و توازن اور حسن کیوں برقرار نہیں رکھ سکتا؟ اس کا مختصر جواب "انکارِ وحی" ہے۔ نظامِ کائنات حسن و خوبی اور عدل کے ساتھ چل رہا ہے

کیونکہ ہر شے وحی کی پابند ہے۔ انسانی زندگی کا نظام کسی صورت احسن طریقے سے نہیں چل سکتا جب تک انسان وحی کی پابندی سے اتباع نہیں کرتا۔ یہ فطری منطق ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

انسان نے اکثر و بیشتر اس زعم میں مبتلا ہو کر ٹھوکر کھائی ہے۔ کہ زندگی گزارنے کے لئے وہ خود آئین مرتب کر سکتا ہے۔ اور اس ضد پر قائم چلا آ رہا ہے۔ حالانکہ ذہن مختلف ہوتے ہیں۔ افکار میں ربط نہیں ہوتا۔ ماحول فکر پر اثر انداز ہوتا ہے اور ضروریات بدلتے رہتے ہیں۔ اور ماضی و حال اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ عقلِ انسانی کے بنائے ہوئے آئین یا قائم کئے گئے نظریات ایک دوسرے سے متصادم ہو کر انسانیت کے لئے باعثِ تباہی و بربادی ثابت ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن ان حقائق کے باوجود انسان وحی کی مداخلت سے گریز کرتا ہے۔ کبھی اس کا قطعی منکر ہوتا ہے۔ اور کبھی تسلیم کر کے اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ اور اس کا سبب صرف یہ ہے۔ کہ وہ جذبات کا غلام ہے اور دنیوی لذتوں سے محروم نہیں ہونا چاہتا (وضاحت ہو چکی ہے۔)

سب کو معلوم ہے کہ اشیائے کائنات میں صفت فطری ہیں۔ انسان میں عقل، فہم، اور شعور کو پیدا کرنے والا خود انسان نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب فطرت کی عطا کردہ نعمتیں ہیں۔ اور انسان مادی لحاظ سے زندگی کے ہر گوشے میں آئینِ فطرت ہی سے ہم آہنگ ہو کر ترقی کرتا ہوا موجودہ مقام پر پہنچا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجموعی طور پر انسانیت کا حالِ زار کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ جس کا سبب اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے کہ احسان ناشناس انسان کائنات میں کارفرما آئینِ فطرت (وحی نبوت) سے باغی ہے۔ جس کا تعلق حقیقت حیات سے ہے جسے قبول کرنے سے تو زمین جنت کا نمونہ بن جائے۔

وحی کے معنی ہیں سریع و لطیف اشارہ، لکھی ہوئی بات، حکم، دل میں ڈال دی گئی بات۔ (قرآن میں متعلقہ آیات کے مفہوم سے معنی اخذ کرنے مشکل نہیں ہے) ایک شہد کی مکھی کو وحی ہوئی .... (۱۶/۶۹) زمین کو وحی ہوئی...... (۹۹/۵) فرشتوں کو وحی ہوئی .... (۹/۱۲) ہر آسمانی کرّے میں اس کا امر وحی کر دیا گیا.. (۴۱/۱۲) حضرت موسیٰؑ کی والدہ کو وحی ہوئی ... (۲۰/۳۸)۔ (۲۸/۷) حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کو وحی ہوئی .... (۵/۱۱۱) حضرت یوسفؑ کو وحی ہوئی (کنوئیں میں جبکہ نبوت عطا نہیں ہوئی تھی) ... (۱۲/۱۵) انبیاء کرام کو کتاب کی صورت میں وحی عطا ہوئی ... (۷/۲۶) شیطان دوستوں کو شیطان کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ (۶/۱۲۱) وحی کے ان اشاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ نظامِ کائنات اور کشمکشِ حیات کا دار و مدار "وحی" پر ہے۔

الغرض محال سورج وحی سے باغی ہو کر بجائے مشرق کے مغرب سے طلوع ہونے لگے، اور آسمانی کرّے امرِ الٰہی (وحی) سے منہ پھیر لیں، زمین اور پہاڑ خود سر ہو جائیں، شہد کی مکھی زہر فراہم کرنے لگے، اور اسی طرح فرشتے اور دیگر مخلوق خود مختار بن کر وحی سے باغی ہو جائے تو سارا نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے لیکن یہ ہو نہیں سکتا کیونکہ ہر شے بے اختیار پابندِ وحی ہے۔ وحی کو تسلیم کرنے اور نہ کرنے میں صرف انسان با اختیار ہے۔ اور انسانی زندگی کا نظم و ضبط اس لئے درہم برہم ہے کہ وہ یا منکرِ وحی ہے یا پابندِ وحی نہیں ہے۔

اللہ اور آخرت پر ایمان ہو لیکن وحیٔ نبوت پر ایمان نہ ہو تو یہ کیفیت دینِ (اسلام) سے خارج ہے۔ وحیٔ نبوت پر ایمان ہو لیکن عمل اس کی تعلیم کے خلاف ہو تو یہ ایمان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور صحیح ایمان کا ثبوت عمل کے نتائج فراہم کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے عمل کے نتائج دیکھ کر اپنے ایمان پر نظرِ ثانی کی ضرورت

درپیش ہے۔

عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں وہ بھی وحی کے مفہوم سے خارج نہیں ہیں۔ اچھے خیالات اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں بُرے خیالات شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں۔ (وضاحت آگے چل کر آئے گی) نیک و بد خیالات پیدا ہونے کا تعلق انسانی ذات کی سیرت و کردار سے ہے۔ بدکردار شخص کے ذہن پر ہمیشہ شیطان سوار رہتا ہے اور نیک کردار شخص کے ذہن پر اللہ غالب ہوتا ہے۔
بلند کردار شخص کے فکر کی کیفیت کے لیے کشف یا الہام یا کوئی اور اصطلاح استعمال کی جائے تو یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ البتہ اس کا شمار وحی نبوت میں نہیں ہو سکتا جس کی ماہیت کو صرف نبی جانتا ہے یا اللہ کو معلوم ہے۔ اس کے علاوہ فکر کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو انسان کی ذات تک محدود ہوتا ہے۔ وحی نبوت انسانیت کے تمام تر تقاضوں کا حل پیش کرتی ہے۔ عظمتِ فکر بیشک عظمتِ فکر کی علامت ہے لیکن مقامِ نبوت اس سے کہیں بلند ہے۔

وحی یعنی کتاب اللہ کے ساتھ حکمت کے عطا ہونے کا ذکر قرآن نے خصوصیت سے کیا ہے جس کے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔ (۳/۴۸، ۳/۱۶۱، ۴/۵۴، ۴/۱۱۳، ۲/۱۲۹)

وحی نبوت بنیادی اصول وضع کرتی ہے۔ حالات اور وقت کے مطابق جس فہم و فراست سے ان اصولوں کی روشنی میں زندگی کے مسائل و معاملات طے کیے جاتے ہیں اسے ”حکمت“ کہا جاتا ہے۔ درحقیقت زندگی کے ہر گوشے میں حکمت ہی سے کام لے کر انسان نتائج یا مفادات حاصل کرتا ہے۔ قدرت نے انسان کو خام مال اشیاء کی صورت میں مہیا کیا ہے اور وہ ”حکمت“ کے ساتھ ان کو کام میں لاتا ہے۔ مثال کے طور پر لوہا اور لکڑی خام مال کی صورت میں انسان کو میسر ہے۔ ان سے جو بے شمار

مفاد حاصل کئے جاتے ہیں وہ سب "حکمت" ہی کا نتیجہ ہیں۔ عقل سے کام لے کر پہلے اشیاء کے خواص کا علم حاصل کیا جاتا ہے پھر ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اور اسکے بعد حسبِ ضرورت فہم و فراست کے ساتھ ان سے مفاد حاصل کیا جاتا ہے۔ جس قدر زیادہ علم و حکمت سے کام لیا جاتا ہے اتنا ہی زیادہ اور بہتر مفاد حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح وحی کے معاملہ میں بھی حکمت سے کام لینا فطرت کا تقاضا ہے۔ وحی بنیادی اصولوں کی صورت میں انسان کو بطور "خام مال" عطا ہوئی ہے۔ سب سے پہلے عقل کو بروئے کار لا کر اس کا مکمل علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ پھر غور و فکر (تجزیہ) کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد حسبِ حالات و واقعات حکمتِ عملی کے ساتھ زندگی کے درپیش مسائل و معاملات حل کرنے چاہئیں۔ جس قدر زیادہ کلامِ الٰہی میں غور و فکر ہوگا۔ اُسی قدر فہم و فراست میں جلاء پیدا ہوگی۔ اور اتنی ہی بلند حکمتِ عملی سے معاملات بخوبی طے پائیں گے۔

پیغمبر نے جہاں لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچایا وہاں انھیں حکمت سے کام لینا بھی سکھایا۔ اللہ کی وحی پر ایمان لانا اور اس کی تعلیم کے مطابق عمل کرنا فرض ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے غور و فکر اور حکمت سے کام لینا سنتِ رسول اللہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ دینِ الٰہی کتاب و حکمت ہے تو یہ زیادہ موزوں ہے۔ قرآن نے بھی "کتاب و حکمت" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ گویا حدیثِ رسول سے مقصد حکمت سے کام لینا ہے۔

وحی پر ایمان رکھنے والوں کے لیے حکمِ خداوندی ہے۔ کہ زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کر کے رکھی جائے تاکہ شیطانی قوتیں سر تابی کی جرأت نہ کر سکیں۔ وقت کے تقاضوں کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکمت کو [illegible] ہوئے

چنانچہ پہلے جس وقت گھوڑے، اونٹ، تلوار، نیزے، خنجر اور تیر و کمان وغیرہ کی ضرورت
تھی اور اب توپ، ٹینک، جہاز، بندوق حتیٰ کہ ایٹمی طاقت فراہم کر کے رکھنے کی ضرورت
ہے۔ لہٰذا اب قوت فراہم کر کے رکھنا فرض ہے۔ اور وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے
ہوئے حکمت سے کام لینا سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ وحی کتاب
اللہ ہے اور اس پر حکیمانہ انداز سے عمل کرنا سنّت ہے۔ مسواک کرنا سنّت نہیں ہے
دانتوں کی صفائی سنت ہے۔ جو حکمت ہے۔ عبا پہننا یا لنگی باندھنا یا کمبلی اوڑھنا
یہ سنت نہیں۔ بلکہ موسم کے لحاظ سے لباس کا استعمال کرنا سنت ہے جو حکمت
ہے۔ اونٹ کی سواری سنت نہیں۔ سفر طے کرنے کے لئے "سواری" کا استعمال
سنت ہے۔ جو حکمت ہے۔ ان مثالوں سے جملہ سنتوں کا قیاس کیا جاسکتا ہے جن
میں مقصد حکمت سے کام لینا ہے۔

دراصل حدیث و سنّت میں فرق کو سمجھنے سے "اطاعت رسول" کی صحیح
نشاندہی ہوتی ہے۔ حدیث قول ہے۔ اور سنت فعل ہے۔ جو روایات حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف "قولاً" منسوب ہیں، وہ حدیث ہیں۔ اور تقاضائے وقت
کے مطابق حکمت سے کام لے کر جو عمل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہ سنت ہے
غیر مشروط اتباع سنت نہیں ہے۔ بلکہ نقالی کو اتباعِ سنت نہیں کہا جا سکتا۔ احادیث
پر غور و فکر کر کے وقت کے تقاضوں کے مطابق وحی کی روشنی میں عمل کرنا سنت ہے
(حکمت ہے) بے سوچے سمجھے تو آیات وحی پر بھی گرنے سے خود وحی نے منع کیا
ہے۔ لہٰذا جو عمل قرآن پر ہو یا حدیث پر جو خلافِ حکمت ہے وہ بدعت ہے۔

سلسلۂ نبوت

"اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور خاندانِ ابراہیمؑ اور خاندانِ عمرانؑ کو تمام لوگوں میں سے نبوت کے لیے منتخب فرمایا" (۳/۳۳) قرآن نے جس ترتیب کے ساتھ انبیائے کرام کا ذکر کیا ہے اس کے مطابق یہی اخذ ہوتا ہے کہ سلسلۂ نبوت حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور آپ کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر قرآن میں تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔

حضرت نوحؑ

جس قوم کی طرف آپ نبی بن کر بھیجے گئے وہ اللہ کے پیغمبروں کو مسلسل جھٹلاتی چلی آ رہی تھی (۲۶/۱۰۵)۔ (ان پیغمبروں کا ذکر قرآن میں نہیں آیا) آپ نے جب قوم کے سامنے نبوت کا دعویٰ کیا اور وحی پر ایمان لانے کی دعوت دی تو تمام دولتمند اور خوشحال لوگوں نے آپ کو پیغمبر ماننے اور وحی پر ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا۔ ایمان لائے تو غریب اور نادار! دولت کے نشے میں بدمست سرکش لوگ کہتے تھے، تم ہماری طرح کے ایک بشر ہوتے ہوئے پیغمبرِ خدا کس طرح ہو سکتے ہو؟ تمہیں ہم پر کون سی فضیلت حاصل ہے۔ اور یہ جو تمہارے پیرو کار بنے ہیں سب حقیر، ذلیل اور جاہل لوگ ہیں۔ ہم تمہاری بات کو کس طرح سچ مان لیں؟ اور پھر نہ تو تمہیں خدا نے خزانے دے رکھے ہیں جن سے تم ہمیں مالا مال کر سکو اور نہ تم غیب کا علم رکھتے ہو۔ یہ سب جھوٹ ہے جو تم نے خود گھڑ لیا ہے۔

آپ جواب میں کہتے: اے میری قوم! اللہ نے اپنی خاص رحمت سے مجھے

منتخب فرما کر مجھ پر وحی نازل کی ہے جو بیّن دلیل ہے جس کی ماہیت کو تم نہیں
سمجھ سکتے ورنہ تمہارے اعتراضات اور مطالبے نادانی کے سبب ہیں۔ میں نے کب یہ
دعویٰ کیا ہے کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور میں غائب کا علم جانتا ہوں؟
میں صرف تمہاری بھلائی چاہتا ہوں اور تمہیں زندگی کے غلط راستے سے روک کر صحیح
راستے پر لانا چاہتا ہوں۔ اور زندگی کا سیدھا راستہ وہی ہے جو اللہ نے بذریعہ
وحی دکھایا ہے۔ اور اللہ ہی الٰہِ حقیقی ہے جس کا حکم ماننے کو تم سے کہہ رہا ہوں۔
ورنہ مجھے ڈر ہے کہ تمہاری موجودہ روش تمہیں عذاب میں ڈال دے گی۔ کیا
تم نہیں سوچتے کہ جو کچھ تمہیں تسلیم کرنے کو کہتا ہوں اس کا کوئی معاوضہ
تم سے نہیں مانگتا؟

قوم کے سرکش لوگ صریحاً انکار کرتے ہوئے کہتے اے نوح! اگر تم سچے ہو
تو جس سے ڈراتے ہو وہ ہم پر عذاب لے آؤ۔ (۱۱ / ۲۵ — ۳۳) ہم اپنے آباؤ
اجداد کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اور یہ تو ہمارے معبود وَدّ اور سُواع اور
یغوث اور یعوق ہیں ان سب کو چھوڑ کر بس ایک خدا کو کیسے مان لیں۔

(۲۳)

حق کے استدلال سے جب باطل لاجواب ہو جاتا ہے تو آتشِ انتقام
بھڑک اٹھتی ہے۔ سرکش لوگ ضد پر اتر آئے اور آپ کو سنگسار کر دینے کی
دھمکیاں دینے لگے اور قتل کرنے کی سازشیں کرنے لگے۔ آخرکار جب حضرت
نوح نے یقینی طور پر محسوس کر لیا کہ قوم ناقابلِ اصلاح ہے تو اللہ سے دعا کی اے
پروردگار یہ نافرمان لوگ گمراہی کی انتہا تک پہنچ چکے ہیں۔ تو ان کو جڑ سے
ان کو دنیا سے نیست و نابود کر دے۔ ورنہ ان سرکشوں کی نسل بھی [illegible]
[illegible] اور زمین میں فساد برپا [illegible]

دعا قبول ہوئی۔ حکم ملا۔ اے نوح! ہماری ہدایت اور نگرانی میں ایک کشتی تیار کرو۔ اور ان سرکشوں کے بارے میں غم نہ کھاؤ۔ جنہوں نے دعوتِ حق کو قبول کرنا تھا وہ کر چکے۔ اب اُن میں سے کوئی اور ایمان لانے والا نہیں ہے۔ اور ان کے لیے تم سے مزید سوال بھی نہ کرنا۔ ان کا غرقاب ہونا مقدر ہو چکا ہے (۱۱/۳۶ تا ۳۷، ۲۳/۲۷ - ۳۰)

آپ کشتی تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ جب کبھی قوم کے سرکش لوگوں کا آپ کے پاس سے گزر ہوتا تو تمسخر اڑاتے۔ آپ جواب میں صرف اتنا کہہ دیتے۔ بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ تمسخر کس کا اڑتا ہے۔ (۱۱/۳۸ - ۳۹)

کشتی مکمل ہو گئی۔ حکم ملا۔ اے نوح! کشتی میں تمام جانوروں کے جوڑے سوار کر لو اور ان لوگوں کو بھی جو ایمان لا چکے ہیں۔ اور جن کے بارے میں تمہیں بتا دیا گیا ہے ان کے لیے اس کشتی میں کوئی جگہ نہیں۔ اگرچہ وہ تمہارے اہل میں سے کیوں نہ ہوں۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور لنگر کھول دیے گئے۔ کشتی تیرتے ہوئے پہاڑ کی مانند بہ نکلی۔ عین اُس وقت بادلوں کا بپھرا ہوا طوفان اُمڈ آیا۔ اور پھر بارش کیا برسنے لگی گویا آسمان نے اپنے دہانے کھول دیئے ہوں اور زمین پانی اگل رہی ہو۔ کشتی ابھی ساحل کے نزدیک تھی کہ نوحؑ کی نظر اپنے لختِ جگر پر پڑ گئی جو پانی میں گھرا ہوا تھا۔ شفقتِ پدری سے دل بھر آیا۔ آواز دی۔ اے بیٹے! آؤ ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ کافر لوگوں کے ساتھ پیچھے نہ رہو۔ بیٹا چلایا۔ ابا! آپ فکر نہ کریں۔ میں پہاڑ پر چڑھ کر محفوظ ہو جاؤں گا۔ اسی لمحے ایک لہر اٹھی اور اُسے بہا لے گئی۔ بیٹے کو ڈوبتا دیکھ کر نوحؑ پکار اٹھے۔ اے اللہ! یہ میرا بیٹا ہے۔ میرے اہل میں سے ہے۔ جواب ملا۔ اے نوحؑ! یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ بدکردار لوگ نیک کردار بندوں کے اہل میں شمار نہیں ہوتے۔ بات کو سمجھو۔ اس کے

(جو مجھ پر نازل ہوئی ہے) یقین جانو کہ اللہ کے سوا کوئی لائقِ عبودیت نہیں ہے۔
(اس کے حکم کی تعمیل کے سوا رہِ فلاح و نجات نہیں ہے)۔

قوم کے سردار (خوشحال اور مقتدر لوگ) انکار کرتے ہوئے کہتے۔ اے ہُودؑ!
تم احمق اور جھوٹے نظر آتے ہو۔ ہماری طرح کے بشر ہوتے ہوئے تم خدا کے پیغمبر کس
طرح ہو سکتے ہو؟ آپ جواب میں فرماتے۔ [illegible] میں تو تم لوگ پڑے ہوئے ہو جو مجھ
پر وحی نازل ہونے پر متعجب ہو۔ غور سے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ اللہ کا
انسانوں تک ہدایت پہنچانے کا یہی طریقہ ہے جس میں کوئی دخل انداز نہیں ہو سکتا۔
اور اگر تم وحی کو تسلیم کر کے زندگی کا صحیح راستہ اختیار کر لو تو اس میں تمہاری اپنی
بہتری ہے۔ حقیقت سے چشم پوشی نہ کرو اور اللہ کے احسان ناآشناس نہ ہو۔
آخر وحی کو تسلیم کر کے اس پر عمل کرنے میں تمہاری فلاح کے سوا کیا ہے؟ آپ کو
جواب وہی ملا جو حق پرستوں کو باطل پرست "مذہبی دیوانوں" کی طرف سے ہمیشہ ملتا
ہے۔ کہتے کہ ہم باپ دادا کا مذہب چھوڑ کر اپنے خداؤں سے روگرداں کس طرح ہو
جائیں۔ اور تمہارے فقط ایک خدا کو تسلیم کریں۔

آپ فرماتے۔ تمہارے بڑوں نے از خود خدا بنائے اور دین کو چھوڑ کر مذہب
گھڑ لیا۔ اور تم لوگ انہی کے جھوٹے نقشِ قدم پر چل نکلے ہو۔ خدا سے ڈرو اور حق پہچانو
(۶۵ - ۷۰) اتنا تو سوچو کہ جس بات کو تسلیم کرنے کیلئے تمہیں ہدایت دیتا ہوں اس کا
کوئی معاوضہ تم سے طلب نہیں کرتا۔ (۵۱)۔

سرکشوں نے جب دیکھا کہ ہودؑ کے دلائل کا ان کے پاس کوئی جواب ہے
ورنہ کسی صورت یہی تبلیغ سے باز آتے ہیں تو آپ کے خلاف تدبیریں کرنے لگے
جس پر آپ کو بھی غصہ ہو گیا۔ ان سے کہنے لگے۔ تم لوگ میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہو کر
[illegible] مجھے مہلت بھی نہ دو۔ میرا اللہ پر بھروسہ ہے جس کی طرف سے عائد

بشر ہے۔ اس کی پیروی کریں تو ہم بھی تب بری طرح گمراہ اور دیوانے ہیں۔ کیا ہم سب میں سے یہی رہ گیا تھا جس پر وحی نازل ہوئی؟ دراصل یہ شخص خودپسندی میں جھوٹ گھڑ رہا ہے۔ (۵۴/۲۴-۲۵)۔

پھر قوم کے سردار صالح سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ ہماری تو امیدیں تم سے وابستہ تھیں اور تعجب ہے کہ تم ہمیں ہمارے خداؤں سے برگشتہ کرنا چاہتے ہو۔ اور ایک ایسی بات کی دعوت دیتے ہو جس کو ہمارے دل قبول نہیں کرتے (۱۱/۶۲)

آپ نے جواب دیا۔ اے میری قوم کے بھائیو! غور سے سوچو۔ مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی ہے جو حق کی روشن دلیل ہے۔ اس کے بعد میں نافرمان ہو جاؤں تو مجھے اللہ کی گرفت سے کون بچائے گا؟ تم لوگ درحقیقت میرے خیر خواہ نہیں ہو۔ (۱۱/۶۳) اور کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جو کچھ میں تمہیں تسلیم کرنے کو کہتا ہوں اس کا کوئی معاوضہ تم سے نہیں مانگتا۔ بلکہ اللہ سے طلب کرتا ہوں۔ (۲۶/۱۴۵)۔

آپ کی تمام کوششوں کے باوجود متکبر لوگ اپنی ضد پر قائم رہے۔ اپنی جہالت کی وجہ سے برائی کو پسند کیا۔ زندگی کی خوشحالی کو چھوڑنے پر وہ نہ مانے بلکہ پیغمبر خدا کو بدشگونی کی علامت ٹھہرانے لگے تو آپ نے ان سے کہا تم لوگ نہیں جانتے کہ تمہاری آزمائش ہو رہی ہے۔ ان کے پاس استدلالِ حق کا کوئی جواب نہ تھا۔ سرکشوں میں سے نو سرکردہ افراد نے آپس میں مشورہ کر کے ایک دوسرے سے حلف لیا کہ رات کو صالح کے مکان پر حملہ کر کے آپ کو قتل کر دیا جائے۔ (۲۷/۴۷-۴۹) اس نیت اور عناد کی تکمیل سے پہلے آخری حجت پوری کرنے کے لئے صالح کے پاس جا کر کہنے لگے۔ اے صالح! اگر تو سچا ہے تو کوئی نشانی دکھا۔ (۲۶/۱۵۴)۔

عطا ہوگی لیکن صرف ان کو جو ظالمین میں سے نہیں ہوں گے۔ (۲/۱۲۴)

بار وحی کندھوں پر پڑا تو ہدایت و نصیحت کی ابتداء گھر سے کی۔ اپنے باپ آزر سے، جو بڑے با اثر لوگوں میں سے تھے، مخاطب ہو کر کہا۔ اے ابا! یہ جو تم بتوں کو خدا بنائے بیٹھے ہو بڑی گمراہی کی بات ہے۔ جو سنتے نہیں، دیکھتے نہیں اور نہ تمہارے کسی کام آسکتے ہیں وہ معبود کیونکر ہو سکتے ہیں؟ ابا! مجھے اللہ نے ایسا علم بخشا ہے جو تمہیں نہیں ملا۔ اگر تم میری اتباع کرو تو میں تمہیں زندگی کے صحیح راستے پر چلا دوں گا۔ ابا! تم نے تو شیطان کی راہ اختیار کر رکھی ہے جو سرکش اللہ کا نافرمان ہے۔ اور مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم بھی شیطان کے ساتھ عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ (۶/۷۵)، (۱۹/۴۱-۴۵)۔

وراثت میں ملے ہوئے خود ساختہ مذہب کی رگ پر انگلی رکھ دی جائے تو مذہبی دیوانے آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ باپ بیٹے کی نصیحت سن کر برہم ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔ اے ابراہیمؑ! اگر تو میرے خداؤں سے برگشتہ ہو گیا ہے۔ تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔ یہاں سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جا۔ بڑے تحمل کے ساتھ باپ سے کہا۔ تو میرا باپ ہے۔ میں تیری سلامتی چاہتا ہوں۔ اور تیرے لئے اللہ سے مغفرت مانگوں گا۔ بے شک وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے۔ میں تمہارے شرک اور جن کو تم اللہ کے شریک ٹھہراتے ہو بیزار ہو کر تم سے الگ ہوتا ہوں۔ اور اپنے اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں جو میری سننے والا ہے۔ (۱۹/۴۶-۴۸)

آپ گھر چھوڑ کر چلے گئے اور گمراہ لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش شروع کر دی۔ بتخانے میں پہنچے جہاں لوگ پرستش کے لئے جمع تھے۔ ان سے کہنے لگے۔ یہ کیا مورتیاں ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو۔ جواب ملا ہمارے باپ دادا انہی کی پرستش کرتے تھے۔ ہم ان کو کس طرح چھوڑ دیں۔ آپ نے کہا تم اور تمہارے

باپ دادا مرتے تھے اور تم بھی گمراہ ہو۔ لوگوں نے آپ کا کہنا ہنسی میں اڑا دیا۔ آپ نے کہا۔ یہ ہنسی مذاق کی بات نہیں۔ میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ اور تمہیں اس ہستی کی طرف آنے کی دعوت دے رہا ہوں جو ارض و سموات کا خالق و مالک ہے۔ جس کے مقابلے میں تم نے بتوں کو رب بنا لیا ہے۔ بخدا میں تمہارے ان بتوں کے خلاف تدبیر کروں گا جب تم میخانے میں موجود نہ ہو گے۔ (۲/ ۵۱ - ۵۷) اور پھر تم کس قدر جاہل اور نادان ہو۔ جو کوکب اور چاند اور سورج کو بھی خدا مانتے ہو۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ان سب کو خالق اکبر ——— اللہ نے پیدا کیا ہے۔ خالق کو چھوڑ کر مخلوق کو اس کے شریک بنائے بیٹھے ہو۔ شکر ہے اللہ کا جس نے مجھے اس جہالت اور ظلمت سے محفوظ رکھا ہے۔ اور یقین جانو کہ میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ اگر تم اللہ کے شریک ٹھہرانے سے نہیں ڈرتے تو میں تمہارے شریکوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ جو سب باطل ہیں۔ عقل پر تھوڑا سا بوجھ ڈال کر سوچو تو تم پر راست و جھوٹ اور دین کا فرق عیاں ہو جائے گا۔ تم لوگوں نے اللہ کے شریک ٹھہرا دیے ان کو مخلوط کر بیٹھے۔ (۶/ ۷۶ - ۸۲)

انہوں نے ان سنی کر دی۔ اور جب میلے میں چلے گئے تو ابراہیمؑ نے تمام بتوں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ سوائے ایک کے جو سب سے بڑا خدا مانا جاتا تھا۔ جس وقت بت پجاریوں نے آکر اپنے خداؤں کا حشر دیکھا تو معبد میں کہرام مچ گیا۔ ہر طرف شور تھا۔ کہ کسی بڑے ظالم نے ہمارے خداؤں سے یہ حرکت کی ہے۔ کسی نے کہا۔ ابراہیمؑ نامی ایک شخص ہے جو ہمارے خداؤں کے بارے میں گستاخی کرتا رہتا ہے۔ یہ حرکت اسی نے کی ہے۔ آپ کو پکڑ کر لایا گیا۔ اور پوچھا گیا یہ حرکت تم نے کی ہے؟ آپ نے کہا۔ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔ اپنے ان خداؤں سے پوچھو اور یہ جو سب سے بڑا خدا صحیح و سالم موجود ہے اس سے کیوں نہیں دریافت کرتے۔

جواب سن کر سب کے دماغ چکرا گئے۔ اور حماقت کے احساس نے سر اٹھایا ہی تھا کہ جذبات نے لپک کر عقل پہ پردہ ڈال دیا۔ غصے سے بول کر کہنے لگے۔ اے ابراہیم! تم بھی طرفہ جنتی ہو کہ ہمارے خدا بولتے نہیں۔ اور کہتے ہو کہ ان سے پوچھ لو۔ آپ نے کہا۔ تو پھر تم عقل سے بالکل اندھے ہو۔ جو نہ سنتے ہیں۔ نہ بولتے ہیں۔ نہ دیکھتے ہیں۔ نہ نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ وہ خدا بن کر تمہارے دلوں میں کیوں کر بیٹھ گئے ہیں؟ جواب کسی کے پاس تو تھا نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ سنتے کیا ہو۔ باتیں بنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر اپنے خداؤں کا بول بالا رکھنا چاہتے ہو تو دیر نہ کرو۔ اور اس شخص کو زندہ جلا دو۔ لوگ فوراً لکڑیاں فراہم کر کے یک آتش کدہ بنا بیٹھے۔ لیکن آتش انتقام سرد ہو کر رہ گئی۔ کیوں کہ ابراہیمؑ بحکم خداوندی اپنے ہمراہیوں کو لے کر وہاں سے ہجرت فرما گئے۔ اور بابرکت مقام فلسطین میں جا آباد ہوئے۔ (۲۱/۷۲-۵۷ ، ۲۹/۲۴ ، ۳۷/۹۸-۹۷)۔

متعلقہ آیت سے یہ اخذ کر لینا مشکل نہیں ہے۔ کہ ابراہیمؑ ہجرت کر کے فلسطین میں جا کر آباد ہوئے۔ لوطؑ آپؑ کے ہمراہ تھے۔ اس مقدس سرزمین میں آپ کو اسحاقؑ فرزند نصیب ہوئے۔ بعد میں اسحاقؑ کے ہاں یعقوبؑ پیدا ہوئے۔ اور یعقوبؑ کی نسل بنی اسرائیل کہلائی۔ (یعقوبؑ کا لقب اسرائیل تھا) اور یہ کہ اسمٰعیلؑ فرزند، ابراہیمؑ ہجرت سے پہلے موجود تھے۔ اور یہ کہ ابراہیمؑ اور لوطؑ فلسطین کی دو الگ بستیوں میں آباد ہوئے۔ (۱۹/۵۰-۴۸ ، ۲۹/۲۷-۲۶ ، ۲۱/۷۲-۷۱ ، ۳۷/۱۰۱ ، ۱۱/۷۳-۶۹)۔

حضرت لوطؑ

فلسطین کی جس بستی میں آپؑ جا کر آباد ہوئے وہاں کی قوم پر آپ نبی مبعوث ہوئے۔ یہ مردود قوم ایک انتہائی شرمناک فحاشی۔ سدومیت (مرد کے ساتھ مرد کی بدکاری) میں مبتلا تھی۔ (الف

دلالت ہو مستعمل ہے جو ایک نبی کی شان میں گستاخی ہے کیوں کہ اس کی نسبت وراثت ہے۔) آپ سے پہلے اس قوم پر نبی مبعوث ہوئے جن کو سرکش لوگ جھٹلاتے رہے۔ لوطؑ نے انھیں راہِ راست پر لانے کے لئے ان سے کہا۔ مجھے اللہ نے تم پر پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تاکہ میں تمھیں زندگی کا صحیح راستہ دکھاؤں جس کا کوئی اجر تم سے طلب کرنے والا نہیں ہوں۔ میرا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ خدا سے ڈرو اور نیک بات تسلیم کرو۔ یہ جو تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف مائل ہو بہت بڑا گناہ ہے حقیقت یہ ہے کہ تم حد سے نکل جانے والے لوگ ہو۔ جواب ملا۔ اے لوطؑ اگر تم اس وعظ و نصیحت سے باز آجاؤ ورنہ بستی سے نکال باہر کر دیئے جاؤ گے۔ لوطؑ نے کہا میں تمہاری حرکتوں سے سخت بیزار ہوں۔ تم ایسی بے حیائی کے مرتکب ہو کہ تم سے پہلے دنیا میں کسی نے ایسا کام نہیں کیا۔ اور رہزنی کرتے ہو۔ اور ناپسندیدہ حرکتیں کرتے ہو۔ میں اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ اس کا جواب قوم کی طرف سے یہ ملا۔ کہ اگر تم راستباز ہو۔ تو ہم پر عذاب لاؤ۔ لوطؑ نے کہا۔ اے میرے پروردگار! مجھے ان مفسد لوگوں پر نصرت عطا فرما۔

(۲۶ : ۱۶۰ – ۱۶۹ ، ۲۹ : ۲۸ – ۳۰)

اسی دوران میں ابراہیمؑ کے پاس اللہ کے دو فرشتے پہنچے اور آپ کو اسحاقؑ و یعقوبؑ کی بشارت دی۔ مہمان نوازی کے لئے آپ نے بھنا ہوا بچھڑا لا کر پیش کیا لیکن آپ یہ دیکھ کر پریشان سے ہوگئے کہ مہمانوں کے ہاتھ کھانے کے لئے نہیں بڑھے۔ فرشتے آپ کی پریشانی بھانپ گئے۔ آپ خوفزدہ نہ ہوں۔ دراصل ہم قوم لوطؑ کی تباہی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ ابراہیمؑ نرم دلی کے باعث فرشتوں سے جب بحث کرنے لگے۔ انھوں نے کہا۔ اس میں دلیل کا کچھ فائدہ نہیں۔ قوم لوطؑ کے لئے اللہ کی طرف سے عذاب نازل ہونے کا فیصلہ ہو

حضرت اسحاقؑ کا ذکر قرآن میں تفصیل کے ساتھ نہیں آیا۔ آپ کے فرزند حضرت یعقوبؑ کا ذکر ان کے بیٹے حضرت یوسفؑ کے قصہ میں کیا گیا ہے۔ یہ خطہ فلسطین میں بنی اسرائیل کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

حضرت یوسفؑ

حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے تھے۔ ان میں یوسفؑ اور آپؑ کا ایک حقیقی بھائی تھا۔ اور دس آپؑ کے سوتیلے بھائی تھے۔

ذہین تر یوسفؑ ایک روز والد سے خواب بیان کرتے ہیں۔ ابا میں دیکھتا ہوں۔ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند میرے آگے سجدہ کر رہے ہیں۔ یعقوبؑ نے کہا۔ بیٹا اس خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا ورنہ وہ تمہارے خلاف تدبیریں کریں گے۔ خواب کی تعبیر یہ ہے۔ کہ اللہ تمہیں بلند مرتبہ پر فائز کرے گا اور علم و حکمت سے نوازے گا۔ جس طرح تمہارے بزرگوں ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ کو نوازا گیا۔ اور یہ نعمت آل یعقوبؑ کے گھرانے میں پورا کرے گا۔ تمہارا رب بڑا علیم و حکیم ہے۔

سوتیلے بھائیوں کے دل میں شیطان نے وسوسہ ڈال دیا کہ ان کے باپ کا رجحان یوسفؑ اور آپؑ کے (حقیقی) بھائی کی طرف زیادہ ہے۔ حسد غالب ہوا اور آپس میں یوسفؑ کے خلاف تدبیریں کرنے لگے۔ آخر کار یہ فیصلہ کر کے کہ یوسفؑ کو دور لے جا کر کسی کنوئیں میں ڈال دیا جائے۔ باپ کے پاس آئے اور کہا ابا آپ یوسفؑ کے بارے میں ہم پر اعتماد نہیں کرتے۔ اسے ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دیں۔ ہم کل سیر و تفریح کے لئے جا رہے ہیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ جنگل میں پھل کھائے گا اور خوب کھیلے کودے گا۔ آخر وہ ہمارا بھائی ہے اور ہم اس کے خیر خواہ ہیں۔ آپ کسی قسم کا وہم یا فکر دل میں نہ لائیں اور خدا سے

ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں۔ ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔
یعقوبؑ نے کہا، بیٹو! میں ڈرتا ہوں تم اسے ساتھ لے جاکر اس سے کہیں غافل نہ
ہوجاؤ اور اسے بھیڑیا کھا جائے۔ سب بھائی بول اُٹھے۔ ابا! ہم ایک پورا گروہ ہیں۔ اگر
ہماری موجودگی میں یوسفؑ کو بھیڑیا کھا جائے تو ہم بڑے نکمے ہیں۔

اجازت مل گئی۔ بردہ فروش یوسفؑ کو ساتھ لے گئے اور حسب ارادہ
آپ کو کنوئیں میں ڈال دیا۔ معصومیت کی گھبراہٹ علیم و خبیر دیکھ رہا تھا۔ "وحی" ہوئی کہ
اے یوسفؑ! گھبراؤ نہیں۔ تم ایک دن اپنے بھائیوں کو جتاؤ گے جو آج تم سے ساتھ انھوں
نے کیا ہے اور وہ بے خبر ہوں گے۔

بھائی کو زندہ درگور کر کے بناوٹی غم کے آثار لئے بردہ فروشوں کا گروہ
گھر لوٹا اور مکر کے آنسو چھلکا کر باپ سے کہنے لگے۔ ابا! ہم کھیل کود میں مشغول ہوگئے
اور یوسفؑ کو پیچھے سامان کے پاس چھوڑ گئے۔ بھیڑیا آیا اور اسے کھا گیا۔ آپ یقین
کریں ہم سچ کہہ رہے ہیں۔ ساتھ ہی جھوٹ موٹ کے خون سے لت پت کپڑے
دکھانے لگے۔ باپ نے سرد آہ بھری اور کہا، تم ایک جھوٹی کہانی گھڑ رہے ہو جسے
تمہارے نفس نے خوشنما کر کے دکھایا ہے۔ لیکن خیر جو ہوا سو ہوا میرے لئے اب صبر
کے سوا چارہ نہیں۔ جو کچھ کہہ رہے ہو اس پر اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

ادھر ویرانے میں یوسفؑ کنوئیں کے اندر بجز اللہ مدد کے منتظر تھے کہ ایک
قافلہ وہاں آ کر رکا۔ ایک شخص نے پانی کے لئے کنوئیں میں ڈول ڈالا۔ اور جب کھینچا
تو خوش ہو کر پکار اٹھا "یہ تو ایک لڑکا ہے"۔ قافلے والے اسے چھپا کر شہر میں لے
گئے اور چند درہموں کے عوض بیچ ڈالا۔ خریدنے والا بڑا متمول شخص تھا۔ یوسفؑ کو
لے کر گھر پہنچا اور بیوی سے کہا۔ یہ ایک انمول موتی جسے سستے داموں خرید کر لایا ہوں
عزت سے ساتھ رکھو۔ ممکن ہے یہ ہمارے لئے سود مند ثابت ہو۔ اور ہم اسے

اپنا بیٹا بنا لیں۔

پس حضرت یوسفؑ مصر کے ایک اونچے گھرانے میں پرورش پانے لگے۔ وقت گزرتا گیا۔ اور آپ علم و حکمت اور فہم و فراست کا پیکر بن کر جوانی کی عمر کو پہنچ گئے۔

جمال و کمال کا مجسمہ حسن کی دلکشی سے سرشار جوان سال یوسفؑ گھر کی مالکہ کے دل میں گھر کر گیا۔

ایک دن جذبات میں بے قابو ہو کر اس عورت نے یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی، کمرے کے دروازے بند کر دیئے۔ اور کہا، یوسفؑ! میرے نزدیک آ جاؤ۔ آپؑ نے جواب دیا، میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، بخدا میں اس شخص کی امانت میں خیانت نہیں کروں گا جس نے اتنی خوبی سے میری پرورش کی ہے۔ مجھے اللہ سے ڈر لگتا ہے، میں یہ ظلم نہیں کر سکتا۔ عورت نے جو صورتحال پیدا کر دی تھی اس میں ایک عام فرد کے لیے بدی کا مرتکب ہو جانا یقینی تھا۔ لیکن جن اللہ کے بندوں میں اس کی توانائی بیدار و غالب ہو وہ قوت شر سے مغلوب نہیں ہوتے۔

یوسفؑ اس ناخوشگوار پراگندہ ماحول سے بچ کر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف لپکے۔ عورت نے دوڑ کر پکڑنے کی کوشش کی تو آپ کا کرتہ پیچھے سے چاک ہو گیا۔ عین اس وقت عورت کا خاوند دروازے پر نمودار ہو گیا۔ بڑی ہوشیاری سے فوراً کہنے لگی، جو شخص تیری بیوی کے لیے بری نیت رکھتا ہو اس کی سزا یہی نہیں کہ اسے قید کر دیا جائے یا سخت سزا دی جائے؟ یوسفؑ نے حقیقت بیان کرتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی، خاوند کے لیے معاملہ الجھ گیا اور قضیہ کے منصف کے پاس لے جایا گیا۔ منصف نے فیصلہ دیا کہ اگر

یوسفؑ کا کرتہ آگے سے پھٹا ہے۔ تو وہ مجرم ہے۔ اور اگر پیچھے سے پھٹا ہے۔ تو وہ سچا ہے اور عورت مجرم ہے۔ کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا پایا گیا تو خاوند نے بیوی سے کہا۔ یہ تمہارا فریب ہے۔ اور عورتوں کے فریب بڑے بھاری ہوتے ہیں۔ نادم ہو۔ اور مغفرت مانگ۔ پھر یوسفؑ سے مخاطب ہو کر درگزر کر دینے کی استدعا کی۔

گھرانہ بڑے آدمی کا تھا۔ بات سارے شہر میں پھیل گئی اور بڑے لوگوں کی عورتوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کہ عزیز مصر کی بیوی ایک غلام کی طرف مائل کیا ہوئی اس کے عشق میں اسیر ہو کر دیوانی ہو گئی۔ ورنہ اس نے اچھا نہیں کیا۔

طعن آمیز باتیں جب عزیز مصر کی بیوی تک پہنچیں تو اس نے ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ اور تمام بڑے لوگوں کی عورتوں کو مدعو کر لیا۔ پھل تراشنے کیلئے سب کے ہاتھوں میں چھریاں تھما دیں۔ اور یوسفؑ کو ان کے سامنے بھیج دیا۔ نگاہیں جب جمال یوسفی پر پڑیں۔ تو چھریاں پھل کی بجائے انگلیاں تراشنے لگیں۔ عزیز مصر کی بیوی کا جذبہ انتقام سرد ہوا۔ اور کہنے لگی دیکھا۔ تم مجھے طعنے دیتی تھیں۔ بے شک میں نے یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بچ نکلا۔ اور اب بھی اگر اس نے میری خواہش پوری نہ کی۔ تو قید ہو گا۔ یا ذلیل ہو گا۔

پھر ایک بار شہر کی ان تمام عورتوں کے جنون شہوت سے یوسفؑ پریشان رہنے لگے۔ اللہ سے دعا کی۔ اے پروردگار! اس کی آزمائش سے بہتر ہے کہ قید خانے میں چلا جاؤں۔ [illegible] حضرت کو جذبہ رقابت [illegible] آپ کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

[illegible]

ہیں۔ اور سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی ہیں۔ درباری تعبیر بتانے سے عاجز ہو کر کہنے لگے۔ بادشاہ سلامت! یہ پریشان خیالات ہیں۔ خواب کے ذکر نے یوسفؑ کے قید خانے کے ساتھی کو چونکا دیا۔ بادشاہ سے عرض کی۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے اجازت دیں تو ابھی آپ کو خواب کی تعبیر لائے دیتا ہوں۔ اجازت ملی تو قید خانے میں پہنچ کر یوسفؑ کے سامنے بادشاہ کا خواب بیان کیا۔ آپؑ نے کہا۔ تعبیر کے ساتھ تدبیر بھی بتاتا ہوں۔ سات برس تمہاری کھیتیاں خوب بارآور ہوں گی۔ اس عرصہ میں جو فصل کاٹو اس کو بالوں میں رہنے دینا۔ اور حسبِ ضرورت دانوں کی مقدار نکالتے رہنا کیوں کہ اگلے سات برس قحط کے ہوں گے جن میں ذخیرہ کی گئی بالیں تمہارے کام آئیں گی۔ پھر خوب بارشیں ہوں گی اور تم لوگ عرق نچوڑو گے۔

اس درباری نے جب یوسفؑ کی زبانی بادشاہ کو تعبیر کے ساتھ تدبیر بھی سنا دی تو بادشاہ نے یوسفؑ کو فوری طور پر حاضر کرنے کا حکم دیا۔ آپؑ نے بادشاہ کا حکم سن کر کہلو بھیجا۔ پہلے مجھے اُن عورتوں کے بارے بتایا جائے کہ آیا حقائق ثابت ہوئے یا نہیں؟

بادشاہ نے تمام متعلقہ عورتوں کو طلب کیا اور ان سے پوچھا کہ یوسفؑ کے معاملہ کی حقیقت کیا تھی؟ سب بول اٹھیں۔ یوسفؑ بے قصور ہے۔ اس کا دامن بے داغ ہے۔ عزیزِ مصر کی بیوی نے بھی اعترافِ جرم کیا۔ یوسفؑ کو جب عورتوں کا اعتراف سنایا گیا تو کہنے لگے۔ میں نے یہ تصدیق اس لیے کی ہے کہ میں خائن نہیں ہوں۔ اور اللہ خیانت کرنے والوں کی رہبری نہیں کرتا۔ اور میں اپنی پاک دامنی کا دعویٰ بھی نہیں کرتا۔ نفسِ امارہ انسان کو برائی کی طرف مائل کرتا رہتا ہے۔ وہ گناہوں سے بچتے وہی ہیں جن کو اللہ اپنے فضل و کرم سے بچائے۔

مہک آ رہی ہے۔ سب نے کہا، آپ اسی پرانے وہم میں مبتلا ہیں۔ اتنے میں خوشخبری
دینے والا دوڑتا ہوا آیا اور بیٹے کا کرتہ باپ کے چہرے پر ڈال دیا۔ مسرت کی تب
نے اندھیرے روشن کر دیئے۔ پکار اٹھے میں نہ کہتا تھا کہ اللہ کی جانب سے جو میں سمجھتا
ہوں۔ وہ تم لوگ نہیں سمجھتے۔

بیٹے باپ سے التجا کرنے لگے، ابا ہمارے لیے اللہ سے مغفرت مانگیے۔ کہا
بیٹو! اطمینان رکھو۔ وہ بڑا غفور رحیم ہے۔ میری دعائیں رد نہیں کرے گا۔

تمام اہل خاندان یوسفؑ کے پاس پہنچ گئے۔ آپؑ نے والدین کو
عزت و تکریم کے ساتھ مسند پہ بٹھایا۔ گیارہ ستارے خمیدہ سر سامنے کھڑے تھے۔
سورج اور چاند مسند پر خمیدہ نظر بیٹھے تھے۔ خواب کی تعبیر پوری ہو چکی تھی۔ یوسفؑ اللہ
کے حضور شکر سجود ہو گئے (۱۲ ـ ۱۱)

حضرت شعیبؑ ۴

آپ قوم مدین کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے
جو پیغمبروں کو مسلسل جھٹلاتی چلی آ رہی تھی —

(۷ / ۱۱) آپؑ نے لوگوں کو ہدایت دیتے ہوئے کہا، اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی
عبودیت اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اور تمہارے پاس اس کی
طرف سے واضح نشانی (وحی) آ چکی ہے۔ ناپ تول پورا کیا کرو۔ اور لوگوں کا حق
غصب نہ کیا کرو۔ اور اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔ اگر تم (وحی پر) ایمان لے آؤ
تو اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ اور تم میں سے جو ایمان لاتا ہے اسے ڈرا دھمکا کر
اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا نہ کرو۔ وہ وقت یاد کرو جب تم تعداد میں چند فرد
تھے۔ اللہ نے تمہیں ایک کثیر جماعت بنا دیا۔ اور دیکھو کہ تم سے پہلے جن قوموں نے
لوگوں پر احسان کیا لیکن جب وہ فساد سے باز نہ آئے تو تباہ ہو گئے۔ اور اگر
تم میں سے ایک گروہ وحی پر ایمان لے آیا ہے اور ایک گروہ نہیں لایا، تو صبر سے

صبر کرو اور انتظار کرو۔ اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو جو سب سے بڑا عادل ہے!

مدین والی قوم سرکش و متکبر کہنے لگے۔ اے شعیبؑ! تمھیں اور جو لوگ تم پر ایمان لائے ہیں ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ یا تو ہمارے مذہب میں آ جاؤ یا اس بستی سے نکل جاؤ۔

شعیبؑ نے کہا۔ اگر ہم تمھارے مذہب سے بیزار ہوں تو بھی؟ دین الٰہی قبول کرنے کے بعد تمھارے جھوٹے مذہب میں لوٹ آئیں تو گویا ہم نے اللہ پر بہتان باندھا۔ ایسا ہم نہیں کر سکتے۔ (۸۸ ـ ۸۹/۷) تم لوگ آسودگی اور خوشحالی کے بدمست ہو کر حق کو جھٹلا رہے ہو۔ اور میں ڈرتا ہوں کہ عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ میں تمھیں یہی کہتا ہوں کہ زندگی میں عدل قائم کرو۔ ایک دوسرے کا حق غصب نہ کرو اور فساد سے باز رہو۔ اگر تم ایمان لے آؤ اور اللہ کے دیئے ہوئے (جائز رزق) پر قناعت کرو تو اسی میں تمھاری بہتری ہے۔ میں تمھارا نگہبان نہیں ہوں۔ جواب ملا۔ اے شعیبؑ! تمھاری صلوٰۃ یہ سکھاتی ہے کہ اپنے باپ دادا سے چلے آئے مذہب اور ان کے خداؤں کو ترک کر دیں اور اپنے مال اپنی مرضی سے خرچ نہ کریں۔ تم تو بڑے نرم دل اور راستباز واقع ہوئے ہو۔ (۱۱/۸۷)

آپ نے کہا۔ اے میری قوم کے لوگو! غور کرو۔ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل روشن پر ہوں اور اس نے مجھے جائز رزق سے نوازا ہو تو کیا اس کے حکم کی خلاف ورزی میں کر سکوں گا۔ اور وہ عمل جس سے تم کو منع کرتا ہوں خود کیسے کروں گا۔ میں صرف تمھاری اصلاح چاہتا ہوں۔ اور جہاں تک ہو سکا میں اس کے لئے کوشش کرتا رہوں گا۔ یہ توفیق مجھے اللہ دینے والا ہے جس پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

نجات دلادے۔ اس کے ظالم لوگوں سے خلاصی عطا کر، اور اپنے پاس میرے لئے جنت میں گھر بنا۔ (۶۶/۱۱)

بیٹی نے جب ماں کو جا کر بتایا کہ فرعون کے لوگ بھائی کو اٹھا کر لے گئے ہیں، تو ماں کلیجہ تھام کر بیٹھ گئی۔ چاہا کہ راز فاش کر دے مگر اللہ کا اشارہ یاد آگیا۔ (۲۸/۱۰) دل کو سنبھالا اور بیٹی سے کہا جاؤ اور کسی طرح بھائی کی خبر لاؤ۔ بہن شاہی محل میں داخل ہو کر دیکھتی ہے کہ ننھے موسیٰ دودھ پینے سے منہ پھیر رہے ہیں۔ وقت کو غنیمت جان کر کہتی ہے: میں ایسا گھرانہ جانتی ہوں جہاں یہ بچہ دودھ پی کر خوب پرورش پائے گا۔ اس طرح ننھے موسیٰ ماں کی گود میں لوٹ آئے۔ آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ اللہ کا وعدہ پورا ہو گیا۔ (۲۸/۱۲-۱۳)

بچپن ماں کی گود میں گزارا، لڑکپن شاہی محلات میں تعلیم و تربیت پا کر جوانی کو پہنچا۔ موسیٰ بھرپور جوان ہو چکے تھے کہ ایک رات آپ کا شہر سے گزر ہوا۔ دیکھتے ہیں کہ دو مرد آپس میں دست و گریباں ہیں۔ ایک قبطی فرعون کی قوم سے تھا اور دوسرا فرد بنی اسرائیل کا تھا جس نے آپ کو مدد کے لیے پکارا۔ مرد خدا کے ایک مکے نے قبطی کا کام تمام کر دیا۔ ارادہ قتل کا نہ تھا۔ بہت پشیمان ہوئے اور اللہ سے مغفرت مانگنے لگے۔ اور عہد کیا کہ آئندہ آپ ظالموں کی مدد نہ کریں گے۔ (آپ کو بعد میں معلوم ہوا کہ زیادتی بنی اسرائیل کے آدمی کی تھی۔) (۲۸/۱۴-۱۷)

اگلی صبح آپ کا شہر سے پھر گزر ہوا تو دیکھتے ہیں کہ وہی شخص ایک قبطی سے الجھا ہوا ہے اور آپ کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ معاملہ کی تحقیق کرنے سے آپ کو معلوم ہوا کہ اس دفعہ بھی اسرائیلی کی زیادتی تھی۔ بنابریں جب آپ نے قبطی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ پکار اٹھا کیا آپ مجھے بھی قتل کرنا چاہتے

تو حسرت کرنے والا نہیں بلکہ ملک پر جابر بننا چاہتا ہے۔ عین اس وقت موسیٰ
کا ایک خیر خواہ دوڑتا ہوا آیا۔ اور آپ کو چپکے سے کہنے لگا۔ بڑے لوگ آپ کو قتل
کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ بہتر ہے آپ دیر نہ کریں اور جلدی سے شہر
چھوڑ جائیں۔ وقت کی نزاکت کو بھانپ کر اللہ کے بھروسہ پر آپ شہر سے نکل پڑے
اور مدین کا رخ کیا۔ (۲۸/۱۸-۲۲)

مدین کے پاس (وہ جگہ جہاں لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلاتے تھے) پر پہنچے
تو دیکھتے ہیں کہ کچھ مرد اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے ہیں اور دو لڑکیاں اپنے
جانوروں کو روک کر ایک طرف کھڑی ہیں۔ آپ نے ان سے پوچھا۔ اس طرح
کیوں کھڑی ہیں۔ کہنے لگیں۔ جب تک چرواہے اپنے جانوروں کو پانی نہ پلا لیں
ہماری باری نہیں آئے گی۔ اور ہمارا باپ بوڑھا ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے
جانوروں کو پانی پلانا ہوتا ہے۔ موسیٰ آگے بڑھے اور ان کے جانوروں
کو پانی پلا دیا۔ لڑکیاں چلی گئیں اور آپ ستانے کو سائے میں بیٹھ گئے۔
دعا کرتے تھے۔ اے پروردگار! میں تیری طرف سے ہر نعمت کا محتاج
ہوں۔ (۲۸/۲۳-۲۴)

چند دنوں بعد ان دونوں میں سے ایک لڑکی شرم و حیا کا پیکر بن کر موسیٰ
کے سامنے کھڑی تھی۔ کہنے لگی۔ آپ کو ابا نے بلا بھیجا ہے تاکہ جانوروں
کو پانی پلانے کا معاوضہ ادا کریں۔ آپ ساتھ ہو لیے اور بزرگ کے پاس جا کر
تمام سرگزشت بیان کی۔ بزرگ نے کہا اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔
تم ظالموں سے بچ کر نکل آئے ہو۔ لڑکیوں میں سے ایک بول اٹھی۔ ابا! کیوں نہ
ہم اس شخص کو ملازم رکھ لیں۔ قوی بھی ہے دیانتدار بھی ہے۔ بڑا اچھا ملازم
ثابت ہوگا۔ بزرگ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد موسیٰ سے مخاطب ہوا۔

اگر تم آٹھ برس میری ملازمت میں رہو تو میں اپنی ایک لڑکی کا نکاح تم سے کر دوں گا اور اگر دس برس پورے کر دو تو یہ تمہاری مرضی پر ہے۔ میں تم پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ اور تم مجھے صالح پاؤ گے۔ موسیٰؑ نے تجویز منظور کر لی اور دونوں کے درمیان اللہ کے نام پر عہد ہو گیا۔ ($\frac{۲۸}{۲۵-۲۸}$)

مدت معاہدہ اور شرط پوری ہو گئی تو موسیٰؑ اپنے اہل خانہ کو لے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔ کوہ طور کے دامن میں پہنچے تو رات کی تاریکی چھا چکی تھی۔ پہاڑ کی بلندی پر آگ کا پتہ تو روشنی دیکھ کر اہل خانہ سے کہنے لگے۔ تم یہاں ٹھہرو میں نے روشنی دیکھی ہے جا کر معلوم کرتا ہوں اور تمہارے لیے تاپنے کو آگ لاتا ہوں۔ یا شاید وہاں کوئی رستہ بتانے والا مل جائے۔ ($\frac{۲۸}{۲۹}$)

پہاڑ پر پہنچے۔ آگ تو نہ تھی البتہ روشنی در راہ بتانے والا مل گیا۔ آواز آئی۔ اے موسیٰ! میں ہوں تیرا پروردگار۔ اپنی جوتیاں اتار دے۔ تو اس وقت طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے۔ اور سن کہ میں نے تجھے نبی چن لیا ہے۔ میری طرف سے وحی کو غور سے سن۔ میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ پس میری عبادت کیا کر۔ اور تبلیغ رسالت کی جدوجہد میں مصروف ہو جا۔ بے شک گھڑی قیامت آنے والی ہے لیکن میں اسے پوشیدہ رکھوں گا تاکہ ہر شخص اپنی کوشش کا بدلہ پائے۔ جو شخص ایمان نہ لایا اور اپنی خواہشات کی پیروی کی وہ جہنمی ہے۔ اس سے ہوشیار رہنا کہیں تجھے حق کی پیروی کرنے سے نہ روکے اور تو بھی ہلاکت میں پڑ جائے۔ اور اے موسیٰ! یہ تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ عرض کیا۔ میری لاٹھی ہے جس پر سہارا لگاتا ہوں۔ اس سے بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں۔ اس کے علاوہ دوسرا بہت سے کام لیتا ہوں۔ حکم ہوا۔ لاٹھی کو زمین پر ڈال دے۔ ڈال دی تو موسیٰؑ دیکھتے ہیں کہ لاٹھی سانپ بن کر حرکت کر رہی ہے۔ حکم ہوا۔

ہو۔ اور اسے کہو کہ بنی اسرائیل پر ظلم کرنے سے باز آجائے یا انھیں تمھارے
ساتھ جانے کی اجازت دے دے۔ اور اسے آگاہ کردو کہ تم اللہ کی نشانیاں
لے کر آئے ہو۔ جن کو جھٹلا کر سرتابی کرنے والے کے لیئے عذاب کا پیغام ہے

(۲۰/۴۸-۴۵)۔ (۲۶/۱۰-۱۷)

موسیٰؑ اور ہارونؑ فرعون کے پاس پہنچے اور اللہ کا پیغام سنایا۔
فرعون کہنے لگا۔ اے موسیٰؑ! کیا تم جب بچے تھے ہم نے تمھاری پرورش نہ کی تھی
اور برسوں تم نے ہمارے ہاں عمر بسر کی۔ اور پھر تمھارے ہاتھوں ایک عمل ایسا
سرزد ہوا جس کو ہم نے نظر انداز کیا۔ تم بڑے احسان ناشناس ہو۔ موسیٰؑ
نے کہا۔ ہاں وہ حرکت مجھ سے نادانستہ اچانک سرزد ہوئی تھی۔ اور یہ میری خطا تھی
اس وقت تم سے ڈر کر میں بھاگ گیا۔ پھر مجھے اللہ نے نبوت عطا کی اور علم
بخشا۔ اور کیا یہی احسان ہے جو مجھ پر رکھتے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا
ہے؟ فرعون کہنے لگا۔ یہ رب العالمین کیا ہے۔ موسیٰؑ نے کہا۔ وہ آسمانوں
اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک ہے اگر تم یقین کرو۔ فرعون
اپنے لوگوں سے مخاطب ہوا کہ سنتے ہو جو موسیٰؑ کہہ رہا ہے۔ کہ اس کا رب
تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا بھی مالک ہے! یہ شخص تو بڑا معمہ دیتا ہے۔ موسیٰؑ
نے کہا۔ بے شک مشرق و مغرب اور جو کچھ ان دونوں میں ہے وہی سب کا رب
ہے اگر تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ فرعون کہنے لگا۔ خبردار! اگر تم نے میرے سوا
کسی اور کو معبود بنایا تو قید کر دیئے جاؤ گے۔ موسیٰؑ نے کہا۔ خواہ میں تمھیں روشن
چیز دکھا دوں؟ فرعون کہنے لگا۔ اگر سچے ہو تو کر دکھاؤ۔ موسیٰؑ نے اپنی لاٹھی
زمین پر ڈال دی تو وہ صریح اژدہا بن گئی۔ اور اپنا ہاتھ جو بغل میں دبا کر نکالا
تو سفید براق نظر آنے لگا۔ فرعون دیکھ کر اپنے درباریوں سے کہنے لگا۔ یہ تو

یہ شخص جادوگر ہے اور چاہتا ہے کہ تم کو اپنے جادو کے زور سے تمہارے ملک سے باہر نکال دے۔ کہو تمہاری کیا رائے ہے؟ درباری کہنے لگے۔ ان کو مہلت دیجئے اور شہروں میں نقیب بھیج کر اپنے سب ماہر جادوگر بلوا لیجئے۔

(۲۶ / ۳۰-۱۰۸) (۷ / ۲۴) (۲۰ / ۵۷-۵۹)

فرعون نے موسیٰ سے کہا۔ ہم تمہارے جیسا اپنا جادو لا کر تمہیں دکھائیں گے۔ تم مقابلے کا دن اور وقت اور جگہ مقرر کرو جس کے ہم دونوں پابند ہوں گے۔ آپ نے کہا۔ روز جشن کھلے میدان میں سورج طلوع ہوتے ہی سب اکٹھے ہو جائیں۔ فرعون نے اپنے تمام ماہر جادوگر اکٹھے کر لیے اور حسب اقرار اجتماع ہو گیا۔ موسیٰ نے (فرض رسالت پورا کرتے ہوئے) پہلے جادوگروں کو نصیحت کی اور کہا۔ تم لوگ کیوں حق کو جھٹلانے کی کوشش کرتے ہو یقین کرو کہ حق کے مقابلے میں باطل ہمیشہ نامراد و برطرف ہو جاتا ہے۔ آپ کی تقریر سن کر جادوگر سرگوشیاں کرنے لگے۔ کہ یہ دونوں بھائی بہت بڑے جادوگر ہیں اور اپنے جادو کے زور سے ہمارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ پھر آوازیں لگنے لگیں۔ اے ہمارے جادوگرو! آج اپنے جادو کا سارا زور صرف کر دو۔ ورنہ مقابلے میں لٹ جاؤ۔ آج جو جیت گیا وہ بازی لے گیا۔ (۲۰ / ۶۴-۵۸)

فرعون کے جادوگر بڑے گھمنڈ سے بولے۔ اے موسیٰ! تم پہل کرتے ہو یا ہم؟ آپ نے جواب دیا۔ تم ہی پہل کرو۔ جادوگروں نے کچھ رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینک دیں جو سانپوں کی طرح حرکت کرتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ موسیٰ خائف ہوئے تو وحی ہوئی۔ اے موسیٰ! ڈرو نہیں۔ اپنا عصا ڈال دو۔ تم ہی غالب رہو گے۔ آپ نے عصا پھینک دیا جو ان جادوگروں

کے "سانپوں" کو نگل گیا۔ (۲۰: ۶۵ - ۶۹)

اپنے جادو کی تمام تر قوت کا حشر دیکھ کر فرعون کے جادوگر سجدہ میں گر گئے اور پکار اٹھے۔ کہ ہم موسیٰؑ اور ہارونؑ کے خدا پر ایمان لاتے ہیں۔ فرعون بھڑک کر طیش میں آگیا اور اپنے جادوگروں سے گرج کر بولا۔ تم میری اجازت کے بغیر اس استاد جادوگر پر ایمان لے آئے ہو۔ میں تمھیں اس کا مزہ چکھاؤں گا۔ تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف اطراف سے کٹوا کر تمھیں کھجور کے تنوں پر لٹکا دوں گا۔ پھر تم کو پتہ چل جائے گا کہ عذاب میرا سخت ہے یا موسیٰؑ کے خدا کا! جادوگر بولے ہم نے خالقِ کل کو پہچان لیا ہے اور وہی ہمارا رب حقیقی ہے۔ اب ہم تجھے ترجیح نہیں دے سکتے۔ ہم تو اپنے رب سے اپنی خطاؤں کی معافی کے طلبگار ہیں۔ اور اس جادو کے لیے بھی جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا۔ ہمارا معبود حقیقی اللہ ہے جو باقی رہنے والا ہے۔ (۲۰: ۷۰ - ۷۳)

اس واقعہ کے بعد موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف متوجہ ہو گئے اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ آپؑ ان سے کہتے۔ اگر تم لوگ اپنے ایمان پر ثابت قدمی کے ساتھ عمل پیرا ہو تو یقیناً اللہ تمھاری مدد کرے گا اور زمین پر سلطنت عطا کرے گا۔

قوم کے لوگ شکایت کرتے۔ کہ آپؑ کے چلے جانے کے بعد ہمیں بڑی بڑی اذیتیں دی گئیں اور اب آپؑ کی موجودگی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپؑ دیکھ رہے ہیں۔ موسیٰؑ جواب میں کہتے۔ گھبراؤ نہیں۔ صبر و استقلال کے ساتھ جدوجہد کرنے والے متقین کا اجر ضائع نہیں ہوتا۔ عنقریب تمھارا رب تمھارے دشمنوں کو ہلاک کر کے تمھیں زمین پر مسلط کر دے گا اور پھر تمھارے ایمان جانچے گا۔ (۷: ۱۲۸ - ۱۲۹)

فرعون اور اس کی قوم کو ہدایت دینے کے لیے قدرت کی نشانیوں کا

ہوا کریں اور ان کے ذہنوں میں یہ خوشخبری جاگزین کی جایا کرے کہ آخر کار کامیابی ایمان والوں کو نصیب ہوگی۔ (۱۲۸/۷)

فرعون کی قوم کے سرداروں نے جب یہ ماجرا دیکھا تو فرعون سے کہنے لگے۔ تُو نے بنی اسرائیل کو اس طرح آزاد چھوڑ رکھا تو ہماری قوم میں فساد پیدا ہو جائے گا۔ پھر تیرے معبودوں کی پرستش کرنے والا کون باقی رہ جائے گا۔ فرعون نے کہا۔ تم دیکھتے ہو کہ بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہونے والے لڑکے قتل کر دیئے جاتے ہیں اور ان کی لڑکیاں زندہ رکھی جاتی ہیں۔ تو پھر کس طرح یہ لوگ ہم پر غالب آنے کی طاقت فراہم کر سکتے ہیں۔ (۱۲۷/۷)

سرداران قوم فرعون کے جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور موسیٰؑ کے خلاف اسے بھڑکاتے رہتے۔ حتیٰ کہ اُسے موسیٰؑ کے قتل پر آمادہ کر لیا اور موسیٰؑ کو پیغام پہنچا دیا گیا کہ اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ آپؑ نے یہ دھمکی اپنی قوم کے لوگوں کو سنائی اور ساتھ انھیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ بھائیو! دھمکی سے اللہ کی پناہ میں آئے ہوئے نہیں ڈرا کرتے، بالکل خوف نہ کرو۔ ایمان والے کافروں سے نہیں ڈرا کرتے۔ (۴۰/۲۶-۲۷)

قوم فرعون کا ایک شخص جو ایمان لا چکا تھا لیکن دل میں چھپائے پھرتا تھا موسیٰؑ کے قتل کا منصوبہ سن کر نہ رہ سکا۔ فرعون اور اس کے حواریوں کے پاس پہنچا۔ اور دلائل و براہین سے انھیں موسیٰؑ کے قتل سے باز رہنے کی تلقین کی لیکن اس کا ان سرکشوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ (۴۰/۲۸-۴۴)

فرعونیت پر قدرت کی نشانیاں اثر انداز ہوئیں۔ نہ موسیٰؑ کے دلائل کارگر ثابت ہوئے اور نہ اس کی اپنی قوم کے شخص کی تلقین پر

موسیٰ کے قتل کا منصوبہ قائم رہا۔ اور پیشتر اس کے کہ اس پر عمل ہوتا قدرت کا
منصوبہ حرکت میں آگیا۔ آپؑ کو حکم ملا اے موسیٰؑ! میرے بندوں کو ساتھ لے کر راتوں
رات اس بستی سے نکل کر دریا کو عبور کر جا۔ بے شک تیرا تعاقب ہوگا لیکن بے
خوف و خطر رہ میں تم لوگوں کے ساتھ ہوں۔ موسیٰؑ اور ہارونؑ رات کے اندھیرے
میں بنی اسرائیل کو ہمراہ لے کر بستی سے نکل گئے۔ صبح ہوتے ہی شور مچ گیا۔ فرعون کو
خبر ملی تو اس نے چاروں طرف سے اپنی ساری قوت فراہم کی۔ اور عقل کا اندھا
سرکشی میں دیوانہ اپنے باغوں اور چشموں اور عزت و احتشام سے محروم ہو کر اپنی
بربادی کے لیے تعاقب میں چل نکلا۔ جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو
دیکھا تو بنی اسرائیل گھبرا گئے۔ موسیٰؑ نے حوصلہ دیا اور کہا جس بات سے تم
خوفزدہ ہو وہ نہیں ہو سکتی میرا پروردگار ہمارے ساتھ ہے اور وہی میری راہبری
کر رہا ہے۔ دریا کے کنارے پر پہنچے تو حکم ملا اے موسیٰؑ! اپنا عصا پانی پر مارو
تعمیل ہوئی تو پانی دو حصوں میں بٹ گیا اور درمیان میں خشک راستہ نمودار ہو
گیا۔ بنی اسرائیل اس خشک رستے پر سے پار اتر گئے۔ عین اس وقت جب
وہ پار اتر چکے تھے فرعون بھی اپنے لشکر کے دوسری طرف ساحل پر پہنچ
چکا تھا۔ دریا میں بنا بنایا رستہ دیکھ کر اس پر چل نکلا۔ جب تمام لشکر
خشک راستے پر اتر گیا تو پانی دونوں طرف سے امنڈ کر آپس میں مل گیا اور اس طرح فرعون
اپنے لشکر کے غرقاب ہو گیا۔ (۲۶/۵۲-۶۶)

فرعون جب ڈوب رہا تھا تو پکارا میں بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان
لاتا ہوں اور فرمانبرداروں میں سے ہوں (۱۰:۹۰) لیکن ایسے لوگوں کی توبہ قبول
نہیں ہوتی جو ساری عمر بدی میں ملوث رہیں اور جب موت آجائے تو کہنے
لگیں کہ اب ہم توبہ کرتے ہیں۔ درحقیقت ان کی توبہ قبول ہوتی ہے جو حالت کفر میں

مریں۔ ایسے لوگ عذابِ جہنم سے نہیں بچ سکتے۔ (۴/۱۸)، (۱۰/۹۱) اور اللہ نے فرعون کے جسم کو محفوظ رہنے دیا تاکہ آنے والی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنا رہے (۱۰/۹۲) (فرعون کا جسم آج بھی محفوظ موجود ہے۔)

موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر کوہِ طور کے دامن میں جا بسے۔ پہاڑ ان کے لیے قلعہ کی مانند تھا۔ بادلوں کے سائے تھے۔ اور کھانے کے لیے من و سلویٰ جیسی عمدہ غذا عام تھی۔ ایک پانی کی کمی تھی جو اس طرح پوری کر دی گئی کہ موسیٰ کو حکم ہوا۔ اے موسیٰ! اپنا عصا پتھر پر مارو۔ تعمیل ہوئی اور بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر لیا۔ (۲/۵۷-۶۳)

وقت گزرتا گیا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بنی اسرائیل کے کچھ افراد نے اس علاقہ میں ایک گروہِ آدم کو دیکھا جو بتوں کی پرستش کرتا تھا۔ بت پرستی کے دورِ غلامی کا نقشِ کہن تحت الشعور سے ابھر آیا۔ موسیٰ سے جا کر کہنے لگے۔ ہمیں پوجا کے لیے معبود کا بت بنا دو۔ قوم کا مدعا یہ سن کر پریشان ہو گئے۔ اور کہا تم بڑے جاہل لوگ ہو۔ کیا تم باطل پرستوں کا انجام اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ چکے؟ اس اللہ کے سوا تمہارے لیے الٰہ تلاش کروں جس نے تمہیں اقوامِ عالم پر فضیلت بخشی اور فرعون کے مظالم سے نجات دلائی۔ بڑے احسان ناشناس ہو جو اتنی جلدی سب کچھ بھول گئے؟ (۷/۱۳۸-۱۴۱)

موسیٰ رنجیدہ خاطر ہو کر کوہِ طور پر چلے گئے۔ دردِ دل کی دوا کے لیے اس سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی تھی۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی آواز آئی۔ — موسیٰ! اتنی جلدی کا کیا سبب ہوا جو قوم کو چھوڑ کر یہاں چلے آئے۔ عرض کیا۔ اے پروردگار! میری قوم مجھ سے کوئی دور نہیں اور میری پیروی کر رہی ہے۔ میں صرف تیری رضا جوئی کی خاطر تیرے حضور جلد آ گیا۔ آواز آئی۔ اے موسیٰ! تیری قوم تو آزمائش

میں پڑی نہ رہی اور تیرے پیچھے سامری نے اُسے گمراہ کر دیا۔ موسیٰ شدید پریشانی کے عالم میں واپس پہنچے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک سونے کے بچھڑے کی پرستش میں مصروف ہیں۔ اُن سے کہنے لگے۔ تم بڑے عجیب لوگ ہو جو اللہ اور اس کے وعدوں، ڈر اُس کے غضب کو اور مجھ سے باندھے ہوئے عہد، سب کچھ اتنی جلدی بھول گئے؟ جواب ملا۔ ہم نے عہد شکنی دانستہ نہیں کی۔ ہمارے پاس زیب و زینت کے زیورات ہم پر بوجھ بنے ہوئے تھے جو ہم نے سامری کے سپرد کر دیئے۔ اس نے ان زیورات سے ایک بچھڑا بنا لیا جس میں سے گائے کی سی آواز نکلتی تھی۔ ہم سمجھے کہ یہی ہے ہمارا اور موسیٰ کا خدا۔ دراصل سامری مردود نے ہمیں بھی بھول میں ڈال دیا ([illegible]) جذبات جب عقل پر غالب آ جاتے ہیں تو حق و باطل کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔

پھر موسیٰ اپنے بھائی ہارونؑ سے مخاطب ہوئے جن کو وہ کوہ طور پر جاتے ہوئے قوم کی نگرانی سونپ گئے تھے۔ ہارونؑ کو بالوں سے پکڑ کر کہا جب تو نے دیکھا کہ لوگ گمراہ ہو رہے ہیں تو اُن کو سختی سے کیوں نہ روکا۔ ہارونؑ کہنے لگے میری ماں کے جائے بھائی! میرے بال نہ پکڑ۔ میں نے ان کو بہت سمجھایا اور بار بار روکا مگر سختی سے احتراز نہ کیا کہ کہیں قوم میں تفرقہ نہ پڑ جائے اور یہ بہت بڑی حکمت عملی تھی۔ ([illegible]) (غور فرمائیے فرقہ بازی بت پرستی سے بھی بدتر ہے!)

اب موسیٰ سامری کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے۔ یہ تو نے کیا کر دکھایا؟ سامری نے جواب دیا میرے علم میں وہ چیز تھی جو دوسروں کے علم میں نہ تھی۔ سونے کا بچھڑا بنا کر نقش پائے رسول سے مٹی بھر خاک لے کر میں نے اس میں ڈال دی اور یہ ترغیب میرے نفس نے مجھے دی۔ موسیٰ

کہنے لگے۔ سامری! تو نے جو کچھ بھی کیا بہت بُرا کیا۔ اب یہاں سے دور ہو
جا اور تو زندگی بھر کہتا پھرے گا "مجھے نہ چھوؤ" اور آخرت کا وعدہ ٹلنے کا نہیں
اور یہ دیکھ اپنے "معبود" کا حشر۔ آپ نے بچھڑے کو جلا کر خاک کر دیا اور
اس کی راکھ پانی میں بہا دی اور کہہ دیا کہ معبود فقط اللہ ہے جو ہر شے پر
محیط ہے (۲۰ / ۹۵-۹۸)

اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل کے دل و دماغ سے گئو پرستی کا
جنون مفقود ہو جانا چاہیے تھا لیکن حقیقت اس کے برعکس ثابت ہوئی۔ موسیٰ
نے لوگوں سے کہا۔ اللہ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کہنے لگے
اے موسیٰ! کیا تم ہمارے ساتھ تمسخر کرتے ہو؟ آپ نے کہا تمسخر کرنا جاہلوں کا شیوہ
ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ کی سنجیدگی دیکھ کر سب بھانپ گئے کہ حکم بذریعہ
وحی ملا ہے۔ دلوں میں گائے رچی ہوئی تھی۔ حجتیں کرنے لگے۔ کبھی کہتے
گائے کی عمر کتنی ہو؟ کبھی اس کا رنگ دریافت کرتے کبھی پوچھتے کس طرح کی اور
کیسی ہو۔ اور جب سوالوں کا جواب پا کر لاجواب ہو گئے تو بادل نخواستہ انہیں
گائے ذبح کرنی پڑ گئی۔ ایک طرف قوم کے لیے "ذبح معبود" میں بڑا سبق تھا
اور ہدایت و نصیحت تھی دوسری طرف تسلسل حیات اور محاسبہ کی یقین دہانی کے لیے
حکمت الٰہی سے ایک مسئلہ درپیش تھا۔ قوم کا ایک شخص قتل ہو گیا تھا اور قاتل کا
پتہ نہیں چل رہا تھا۔ حکم ہوا کہ ذبح شدہ گائے کے گوشت کا ٹکڑا مقتول
پر مارا جائے۔ تعمیل ہوئی تو مقتول بول اٹھا۔ سب نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خدا
کے حکم سے مُردہ گوشت نے مُردے کو زندہ کر دیا ہے تو حق تعالیٰ کے لیے
موت کے بعد مخلوق کو زندہ کر دینا کون سا مشکل کام ہے لیکن بدبخت قوم
کے دل پتھر کے پتھر رہے۔ اور پتھر تو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے چشمے

پھوٹ نکلتے ہیں۔ افسوس کہ ان کے دلوں سے ایمان کی ایک شعاع تک نہ پھوٹی (۲: ۵۲-۵۴)

موسیٰؑ قوم کی ہٹ دھرمی دیکھ کر بڑے مضطرب ہوئے اور کہا۔ "ایک بچھڑے کو معبود بنا کر کب تک خود پر ظلم کرتے رہو گے۔ اپنے نفسوں کو مارو اور دل سے بچھڑا نکال کر حق کی طرف آؤ۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے وہ بڑا رحیم ہے تمہارے سابقہ قصور معاف کر دے گا۔" بت پرستی چھوڑ کر غیب پرستی اختیار کرنا بڑا مشکل ہے، جواب دیا۔ "اے موسیٰ! جب تک تمہارے رب کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں ہم ہرگز یقین نہیں کریں گے۔" حضرت موسیٰؑ محسوس کر گئے کہ قوم انتہائی پستی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ حجت کو پورا کرنے کے لیے آپ نے ان میں سے ستر آدمی جو پیش پیش تھے لے کر اللہ کے ٹھہرائے ہوئے وقت پر کوہِ طور پر پہنچ گئے۔ اللہ نے تو کیا دکھائی دینا تھا ایک زوردار کڑک نے پہاڑ کو لرزا دیا۔ موسیٰؑ پکار اٹھے۔ "اے پروردگار! بے شک تو ان کو اور ان لوگوں کو ہلاک کر دینے پر قادر ہے۔ کیا تو چند احمقوں کے سبب ہم سب کو ہلاک کر دے گا؟ جانتا ہوں کہ یہ تیری طرف سے آزمائش ہے اور تو جسے چاہے بھٹکا دے جسے چاہے راہ دکھا دے۔ ہم پر رحم فرما، بخشش دے۔ تیرے سوا ہمارا کون ولی ہے۔" اللہ نے انھیں موت کے منہ سے بچا لیا تاکہ شکرگزار ہو کر ایمان لے آئیں۔ (۲: ۵۵-۵٦)

کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ موسیٰؑ سے کہنے لگے۔ "ہم مسلسل ایک ہی قسم کی غذا سے اکتا گئے ہیں۔ اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لیے زمین سے سبزی، ترکاری، گیہوں، دال، پیاز اور لہسن جیسی چیزوں کا سامان کر دے۔" آپ نے کہا۔ "تم بھی عجیب لوگ ہو جو اعلیٰ غذا کے بدلے ادنیٰ کی

خواہش کرتے ہو۔ اگر تمہیں ایسی چیزوں کی طلب ہے تو شہر کا رُخ کرو وہاں یہ سب کچھ مل جائے گا اور یاد رکھو! شہری زندگی اختیار کرنے سے پہلے اپنے گناہوں پر نادم ہو کر اللہ سے معافی مانگو ورنہ عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ ظالموں نے آپؑ کی نصیحت کی کوئی پرواہ نہ کی اور سرِ تسلیم خم کرنے کی بجائے سرکشی لیے نئی زندگی میں داخل ہوئے (۲/۵۸-۶۱)

اللہ کی برگزیدہ قوم بھی عقل و علم سے سرشار تھی۔ شہری زندگی میں جا کر لوگوں نے مادی لحاظ سے خوب ترقی کی اور بڑی قوت فراہم کرلی۔ لیکن دل ان کے صنم آشنا رہے۔ درسِ حقیقت دینے کے لیے قدرت انسان کو آزمائش میں ڈال کر امتحان لیتی ہے اور زعم دور کر دیتی ہے۔ موسیٰؑ نے قوم سے کہا اللہ نے تمہیں اقوامِ عالم پر فضیلت بخشی ہے۔ دنیا کی تمام نعمتوں سے سرفراز کیا ہے اور آج تمہیں خوب طاقتور بنا دیا ہے۔ یہ سب اللہ کے احسانات ہیں۔ اللہ نے تمہارے لیے حکم صادر فرمایا ہے۔ کہ اپنی قوت کے ساتھ بہادر بن کر اٹھو۔ اور مقدس سرزمین (فلسطین) پر قبضہ کرلو۔ بے شک قوت ان کے پاس تھی لیکن بہادری کے سرچشمہ ایمان سے دل خالی تھے کہنے لگے۔ اے موسیٰؑ! وہاں کے لوگ طاقت میں ہم سے کہیں برتر ہیں۔ ہم ان سے نبرد آزما نہیں ہو سکتے۔ کوئی ایسی سبیل نکالو کہ دشمن خود ہی ملک چھوڑ جائیں ورنہ ہم تو ختم ہو جائیں۔ ان میں سے ایمان والوں نے بھی حوصلہ دیا کہ ڈرتے کیوں ہو۔ اگر تمہارا ایمان اللہ پر ہو تو یقیناً تم دشمن پر غالب آ سکتے ہیں۔ بھلا یہ کب مانتے۔ موسیٰؑ سے کہنے لگے۔ ہم میں دشمن کے مقابلہ کی تاب نہیں ہے۔ تم اور تمہارا بھائی (ان ایمان کے دعویداروں کے ہمراہ) جا کر جنگ آزما ہو۔ موسیٰؑ نے جواب سن کر اللہ کی طرف رجوع کیا۔ عرض کیا۔ اے اللہ! میں اپنی اور

اپنی جان کے سوا کسی پر اختیار نہیں ہوں۔ تو ان فاسق لوگوں اور ہم میں
فیصلہ فرما دے۔ وحی ہوئی۔ اے موسیٰ! ان لوگوں پر مقدس سرزمین چالیس
برس کے لیے حرام کر دی گئی ہے۔ یہ عرصہ ان کے لیے سرگردانی کا ہے۔
(مائدہ ۲۰) (آئندہ واقعات سے اخذ ہوتا ہے کہ دشمن نے بنی اسرائیل پر حملہ
کر کے ان کی بستی پر قبضہ کر لیا اور یہ لوگ بھاگ کر پھر کوہِ طور کے دامن میں جا
بسے)

موسیٰ کو اللہ نے چالیس راتوں کے لیے کوہِ طور پر طلب کر لیا۔
ہارون کو قوم کی نگرانی سپرد کر کے آپؑ کوہِ طور پر چلے گئے۔ عشقِ حقیقی کے
جذبہ شوقِ حق ہی جانتے ہیں۔ معلوم تھا آزما چکے تھے لیکن مقدس جذبات
بے تاب ہو کر پکار اٹھے۔ اے پروردگار! مجھے اپنا جلوہ دکھا۔ آواز آئی۔
اے موسیٰ! تو مجھے دیکھنے کی تاب نہ لا سکے گا۔ دیکھ اس پہاڑ کی طرف۔ یہ
ٹھہرا رہا تو تو بھی مجھے دیکھ سکے گا۔ نہ جانے پہاڑ نے کیا دیکھا کہ ریزہ ریزہ
ہو گیا۔ موسیٰ بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو گڑگڑانے لگے۔ خدایا! تیری ذات
پاک ہے۔ میں توبہ کرتا ہوں اور یقین کرنے والوں میں سب سے پیش پیش
ہوں۔ ارشاد ہوا۔ اے موسیٰ! میں نے تجھے نبوت عطا کی اور تجھ سے کلام ہوا۔
اس پر شکر ادا کر اور شکر گزار ہو۔ پھر آپؑ کو باوضاحت لکھی ہوئی وحی کی تختیاں
عطا کرتے ہوئے فرمایا۔ ان پر مضبوطی سے کاربند رہ اور اپنی قوم کو بھی ان پر
کاربند رہنے کا حکم سنا دے۔ عنقریب تجھے معلوم ہو جائے گا کہ فرمانبردار
کون ہے اور نافرمانی کون کرتا ہے۔ جو لوگ وحی سے سرکشی کر کے منہ پھیرتے ہیں
وہ قدرت کی تمام نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اور ایسے
لوگ زندگی کا سیدھا راستہ کبھی نہیں پاتے اور جو اعمال بھی یہ کرتے ہیں اچھے

وہ کتنے ہی اصلاحی و تعمیری اور ارتقائی نظر آتے ہوں) سب اکارت جائیں۔ آخرت میں صلہ اعمال کے لحاظ سے (قانونِ وحی کے مطابق) ملے گا۔ . . . .

(٧ / ١٤٦ - ١٤٧)

موسیٰؑ تختیاں لے کر قوم کے پاس آئے اور اُن پر نوشتہ وحی کی روشنی میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ وقت گزرتا گیا۔ رفتہ رفتہ قوم کے فرسودہ، غلامانہ اور مذہبی ذہنیت رکھنے والے زندگی کو خیرباد کہہ کر نئی نسل کے سپرد کرتے چلے گئے اور قوم کے نوجوان وحی کی تعلیم و تربیت لے کر صحیح ایمان و عمل سے سرشار ہو کر ابھرتے چلے گئے۔ چالیس برس گزر چکے تھے۔ حکم نبی نوجوانوں میں گونج رہا تھا کہ اٹھو ارضِ مقدس سرزمین پر قبضہ کرو۔ وحی کی روشنی سے منور دلوں میں جلا پیدا ہوئی۔ مجاہدینِ خدا ابھر کر اُٹھے اور سرزمینِ مقدس کے وارث بن گئے (٥ / ٢٠ - ٢٦)

بنی اسرائیل کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ وحی کی تعلیم کا اثر موسیٰؑ کی زندگی تک قائم رہا۔ جب آپؑ وفات پا گئے تو قوم انحطاط پذیر ہو گئی۔ قدرت نے دامنِ حیات پھر تھام لیا اور بنی اسرائیل کی طرف نبی بھیجا۔ آپ کا نام قرآن میں نہیں آیا۔ ارضِ مقدس کا کچھ حصہ (قوم کے اختلاف کی وجہ سے) بنی اسرائیل کے قبضہ سے چھن چکا تھا۔ لیکن قوم کے کچھ لوگوں میں وحی کی تعلیم کا اثر ابھی موجزن تھا۔ انہیں نقصان کے احساس نے مجبور کیا تو پیغمبر سے کہنے لگے۔ آپ ہمارے لئے ایک سالار مقرر کر دیں تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کر کے اپنا چھنا ہوا علاقہ دشمن سے واپس لے سکیں۔ پیغمبر نے کہا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں جہاد کا حکم ملے اور تم لڑنے سے گریز کرو۔ کہنے لگے۔ ہم حق کے لئے کیوں نہ لڑیں گے۔ جبکہ ہمارے وطن کا ایک حصہ ہم سے چھین لیا گیا ہے اور ہمیں بال بچوں سے جدا کر دیا گیا ہے

ہے۔ (۲/۲۴۶)

ان کے مطابق پیغمبر نے طالوت کو سالار مقرر کر دیا۔ سرداران قوم (جن کے اندر وہ نخوت تو پیدا ہو چکا تھا) معترض ہوئے کہ ہم بے مال و دولت دنی شخص کو اپنا سالار تسلیم نہیں کر سکتے۔ پیغمبر نے کہا۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اس سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ طالوت کی شخصیت علم و جسم کے لحاظ سے سب میں افضل ہے۔ معاملہ زیر بحث و تکرار تھا کہ اچانک اللہ کے فرستادے وہ تابوت لے کر وہاں پہنچ گئے جس میں موسیٰؑ اور ہارونؑ کی یادگاریں اور تبرکات کا ذخیرہ تھا۔ قوم کے لئے اب راہ گریز نہ تھی۔ مجبوراً پیغمبر کے فیصلہ کے سامنے جھکنا پڑا اور جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں (۲/۲۴۸)

تیاری مکمل ہوئی۔ جنگ کے لئے روانہ ہونے سے پہلے طالوت نے اپنے لشکر کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ تم میں سے کوئی شخص رستے میں آنے والی ندی سے پانی نہ پیئے۔ سوائے اس کے منہ تر کر لیا جائے۔ اس میں تمہارے لئے آزمائش ہے اور جو شخص اس ہدایت پر عمل نہیں کرے گا اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں ——— طویل سفر اور گرمی کی شدت۔ آزمائش کڑی تھی۔ لشکر جب ندی پر پہنچا تو سوائے چند ایک کے سب نے جی بھر کے پیاس بجھائی۔ جب ندی کے پار اترے تو پانی سے پیٹ بھرے بیٹھے والے کہنے لگے۔ ہم میں جالوت (دشمن کی فوج کا سالار) اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رہی۔ آزمائش میں پورے اترنے والے اگرچہ تعداد میں کم تھے لیکن جذبۂ ایمان سے مست تھے۔ کہنے لگے۔ ہمت نہ ہارو۔ دشمن کی قوت تمہاری نظر کا فریب ہے۔ ہمارا خدا ساتھ ہے جو اپنے صبر اور استقامت والے بندوں کا مددگار ہے۔ تھوڑی سی جماعت کا بڑی قوت پر غالب آ جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے

(۲/۲۴۹)

میدانِ کارزار گرم ہوا۔ اللہ کے سپاہی صبر و استقلال کی توفیق اور فتحیابی کی دعائیں مانگتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ جالوت داؤدؑ کے ہاتھوں مارا گیا۔ لشکرِ خدا کو فتح نصیب ہوئی اور ایک وسیع سلطنت ہاتھ آگئی جس کی بادشاہت داؤدؑ کو سونپ دی گئی (۲/۲۵۰-۲۵۱)

حضرت داؤدؑ

آپؑ کے بارے میں قرآن نے صرف ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ ایک دفعہ دو اشخاص آپس میں جھگڑتے ہوئے بجائے سیدھے راستے کے دیوار پھاند کر شاہی محل میں داخل ہوئے۔ داؤدؑ ان کو دیکھ کر گھبرا سے گئے۔ دونوں آپؑ کی گھبراہٹ بھانپ کر کہنے لگے۔ خوفزدہ نہ ہوں ہم فیصلہ کے لئے آپؑ کے پاس ایک مقدمہ لے کر آئے ہیں۔ ایک بار یہ میرا بھائی ہے جس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے جسے چھین کر اپنی دنبیوں میں ملانا چاہتا ہے اور اس کے لئے مجھ پر زبان درازی کرتا ہے۔ آپؑ نے کہا، یہ شخص ہوس میں تم پر ظلم کرتا ہے اور اکثر شریک ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں سوائے ایمان والوں کے۔ جو بہت قلیل ہوتے ہیں۔ مقدمہ کا فیصلہ تو آپؑ نے سنا دیا لیکن واقعہ کے اس طرح رونما ہونے کے سبب متذبذب ہوئے کہ شاید کسی معاملہ میں آپ سے کوئی غلط فیصلہ سرزد ہوا ہے۔ پریشان ہو کر سجدہ ریز ہو گئے اور اللہ سے مغفرت مانگنے لگے۔ وحی ہوئی۔ اے داؤدؑ! میں نے تجھے معاف کیا۔ بے شک تجھے میرا قرب حاصل ہے اور تجھ کو اعلیٰ مقام پر فائز کر کے ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں۔ ایک سلطنت کی بادشاہی تیرے سپرد کی گئی ہے۔ تیرا فرض ہے کہ فیصلے انصاف سے کیا کر اور حق کی راہ سے بھٹک جانے کا مر

اور بھٹکنے والے میرے محاسبے کو بھول کر عذاب میں گرفتار ہو جاتے ہیں (۳۸/۲۶-۲۶)

(اس واقعہ کے متعلق جو روایات تفاسیر میں ملی ہیں ان کا ذکر کرنا بھی ایک پیغمبر کی شان میں گستاخی ہے۔ مذکورہ آیات سے اتنا کچھ اخذ کر لینا واجب ہے کہ کسی معاملہ میں فیصلہ کرتے ہوئے آپ سے لغزش ہوئی اور اللہ نے حکمت عملی سے تنبیہ فرما دی)

حضرت سلیمانؑ

آپ داؤدؑ کے وارث ہوئے اور نبی مبعوث کیے گئے۔ وراثت میں جو سلطنت آپ کو ملی وہ عظمت کے لحاظ سے لاثانی تھی۔ بری، بحری اور فضائی قوت پر تکیہ تھا صنعت و تجارت عروج پر تھی۔ جن و انس اور حیوانوں کے لشکر آپؑ کے زیر فرمان تھے۔ علم و حکمت میں آپ کو بلند مقام حاصل تھا۔ (۲۷/۱۶-۱۷، ۳۴/۱۲-۱۳، [illegible])

ایک دفعہ آپؑ کا گزر وادی نمل سے ہوا۔ دیکھتے ہیں کہ ایک نملہ اپنے ساتھیوں سے پکار کر کہہ رہی ہے کہ سلیمان کا لشکر آ رہا ہے۔ اپنے گھروں میں گھس جاؤ ورنہ ان کے پاؤں تلے روندے جاؤ گے اور انہیں خبر تک نہ ہوگی۔ سلیمانؑ کے کانوں میں جب یہ آواز پڑی تو مسکرائے۔ مسکراہٹ میں احساسِ تکبر کا نشہ نہ ہو۔ فوراً دست بدعا ہوئے۔ اے پروردگار! مجھے قابو میں رکھ۔ اپنے احسانات کا شکر گزار ہونے کی توفیق عطا کر جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کئے ہیں اور مجھے ایسے اعمال کرنے کی توفیق دے جو تجھے پسندیدہ ہیں۔ اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل کر (۲۷/۱۸-۱۹)

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ آپؑ لشکر طیر کی حاضری لیتے ہوئے دیکھتے

ہیں کہ ہدہد غیر حاضر ہے۔ پوچھنے لگے۔ ہدہد دکھائی نہیں دے رہا۔ اگر بلا جواز غیر
حاضر ہے تو اسے سخت سزا دی جائے گی یا ذبح کر دیا جائے گا۔ چند لمحوں بعد ہدہد آ
پہنچا اور آپؑ سے عرض کی۔ میں ایک خبر لایا ہوں جو آپؑ کے علم میں نہیں ہے۔ قوم
سبا کے بارے میں تحقیق کر کے آیا ہوں جس کی حکمران ایک عورت ہے
ساز و سامان بے شمار رکھتی ہے اور ایک بڑے تخت کی ملکہ ہے۔ یہ قوم گمراہی
میں اللہ کی بجائے سورج کی پرستش کرتی ہے۔ یہ سن کر سلیمانؑ نے ایک خط لکھا
اور ہدہد سے کہا یہ اس قوم کی طرف لے جا۔ پھر دیکھتے ہیں کہ ان کی طرف
سے کیا جواب آتا ہے اور تیرے جھوٹ سچ کا بھی پتہ چل جائے گا۔

(۲۷/۲۰-۲۸)

ملکۂ سبا کو خط پہنچا تو درباریوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ میری طرف
یہ نامۂ گرامی سلیمانؑ کی طرف سے آیا ہے۔ اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے شروع ہوتا
ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ تم لوگ مطیع و منقاد ہو کر میرے پاس چلے آؤ اور میرے
اس حکم میں سرکشی سے کام نہ لو۔ درباریو! مشورہ دو کہ کیا کیا جائے۔ تم
جانتے ہو میں تمہارے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔ درباری کہنے
لگے۔ ہم بڑی قوت کے مالک ہیں اور جنگجو بھی ہیں لیکن حکم آپ نے ہی دینا ہے۔ خود
ہی سوچ کر فیصلہ کیجئے۔ ملکہ نے کہا۔ بادشاہ جب حملہ آور ہوتے ہیں تو تباہی مچا
دیتے ہیں اور عزت والے ذلیل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی کریں گے
میری تجویز یہ ہے کہ ان کی طرف کچھ تحفہ بھیجتی ہوں۔ پھر دیکھتی ہوں کیا جواب ملتا ہے۔

(۲۷/۲۹-۳۵)

سلیمانؑ کے پاس تحفہ پہنچا تو ملکہ کے قاصد کو یہ پیغام دے کر واپس
بھیجا کہ ان تحفوں کی شان سے تم جیسے لوگ ہی خوش ہوتے ہوں گے۔

ایک عرصہ گزر گیا۔ اس طرح کسی کو سلطنت کے زوال کا علم نہ ہو سکا ورنہ آپ کے لشکر کام کرتے رہے۔ ورنہ وہ باغی ہو کر کب کے آزاد ہو چکے ہوتے (۳۴/۱۴) (۳۸/۳۴)۔ سلیمانؑ کے بعد چند انبیاء کرام کا ذکر قرآن میں اختصار کے ساتھ آیا ہے۔

حضرت ایوبؑ

آپ کو ایک دفعہ سانپ نے ڈس لیا۔ (شیطان کے معنی سانپ کے بھی ہیں اور یہاں یہی معنی لیئے جا سکتے ہیں کیونکہ ایک پیغمبر شیطان سے مغلوب ہو کر بے بس نہیں ہو سکتا) آپ نے دعا کی اے پروردگار! میں بڑی مصیبت اور آزار میں بے بس ہوں۔ حکم ہوا۔ قدم بڑھا۔ تھوڑے فاصلے پر تجھے ٹھنڈا پانی ملے گا۔ اسے پی اور اس سے غسل کر۔ اور پاس ہی ایک پودہ دیکھے گا اس کی شاخ لے کر (زخم پر) لگا اور قسم نہ توڑ۔ اللہ نے اپنے بندے ایوبؑ کو ثابت قدم پایا۔ آپ بڑے رجوع کرنے والے تھے۔ اللہ نے آپ کا گھر پھر آباد کیا اور آپ کے خاندان کو خوب بڑھایا۔ عقل والوں کے لیئے اس میں نصیحت ہے (۲۱/۸۳-۸۴) (۳۸/۴۱-۴۴) (بعض آیات دقیق متشابہات کی صورت میں سامنے آتی ہیں لیکن غور و فکر کرنے سے محکمات میں بدل جاتی ہیں۔ اسی لیئے اللہ نے عقل سے کام لے کر غور و فکر کرنے کی بار بار ہدایت کی ہے)

حضرت یونسؑ

ایک دفعہ آپ سے لغزش ہوئی اور کسی معاملہ میں وحی کا انتظار کیئے بغیر جلد بازی سے قیاس پر مبنی فیصلہ کر کے مسافروں سے بھری کشتی میں سوار ہو گئے۔ کشتی پانی میں اٹک گئی تو آپ کو ایک بہت بڑی مچھلی نے نگل لیا۔ بے شک آپ کا فیصلہ ایک لغزش تھی لیکن آپ برگزیدوں میں سے تھے۔ اللہ کی قدرت سے مچھلی نے آپ کو خشکی پر

ایک بیلدار درخت کے سائے تلے ڈال دیا۔ ہوش میں آئے تو اللہ سے مغفرت مانگنے لگے۔ پھر آپؑ کو ایک لاکھ سے کچھ زائد آبادی پر مبعوث کیا گیا۔ اس بستی کے لوگ آپؑ پر دل سے ایمان لے آئے اور وحی پر کامل ایمان لے آنے کے سبب وہ مدت دراز تک زمین پر مسلط رہے اور اللہ کی نعمتوں سے خوب مستفید ہوتے رہے۔ قرآن نے اس قوم کو مثالی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ارشاد ہے۔ ایسی کوئی بستی کیوں نہ ہوئی جو یونس کی قوم کی طرح ایمان لاتی اور ترقی کرتی وہ دنیا و آخرت کے عذاب سے محفوظ رہتی (۱۰: ۹۸)، (۳۷: ۱۳۹-۱۴۸)

اس کے بعد حضرت ادریسؑ، حضرت ذوالکفلؑ اور حضرت الیاسؑ کا ذکر قرآن میں اجمالاً کیا گیا ہے۔ اور ان کے بعد ایک ہی زمانہ میں دو نبیوں کا ذکر مختصر طور پر بصورت پیش منظر آمد و بعثت حضرت عیسیٰؑ کیا گیا ہے۔

حضرت زکریاؑ بڑھاپے میں ایک دن محراب میں کھڑے ہو کر آپؑ دعا کرتے ہیں۔ اے پروردگار! مجھے اپنے خاص فضل و رحمت سے صالح اولاد عطا فرما۔ تب فرشتوں کی زبانی وحی ہوئی اے زکریا! تجھے یحییٰ کی بشارت دی جاتی ہے جو اللہ کی تصدیق کرنے والا ہوگا۔ سردار ہوگا، پارسا ہوگا، نیکوکار ہوگا اور اسے نبوت سے سرفراز کیا جائے گا۔ زکریاؑ نے عرض کیا اے پروردگار! میں بڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ ہمارے ہاں لڑکا کیسے ہوگا؟ جواب ملا میں جو چاہتا ہوں وہ ہو جاتا ہے۔ عرض کیا میرے لئے نشانی مقرر فرمائیں۔ ارشاد ہوا تم تین دن لوگوں سے اشارے کے سوا بات نہ کر سکو گے۔ اور صبح و شام اپنے رب کو خوب یاد کرو (۳: ۳۸-۴۱)

حضرت عمرانؑ آپؑ کی اہلیہ بیوی نے دعا کی اے پروردگار! جو میرے بطن میں ہے اسے تیری نذر کرتی ہوں۔ قبول

فرما۔ تُو سننے والا جاننے والا ہے۔ پھر جب آپ کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو عمران کی بیوی کہنے لگی۔ اگرچہ لڑکی لڑکے کی طرح نہیں ہوتی تاہم اللہ ہی کو بہتر علم ہے۔ میں اس کا نام مریمؑ رکھتی ہوں اور اسے اور اس کی اولاد کو اللہ کی پناہ میں سونپتی ہوں اللہ نے پسندیدگی کے ساتھ قبول فرمایا اور مریمؑ کی پرورش کا بندوبست زکریاؑ کی کفالت میں کر دیا (۳/۳۴-۳۷)

مریمؑ جب جوان ہو گئیں تو ایک دن فرشتوں نے آپ کو بشارت دی کہ آپ کو اللہ نے اپنی قبولیت میں منتخب فرمایا ہے۔ پاکیزگی عطا کی ہے اور جہان کی عورتوں پر فضیلت بخشی ہے۔ سو اپنے رب کے سامنے جھکنے والوں کے ساتھ جھکی رہیں اور اللہ آپ کو ایک فرزند کی بشارت دیتا ہے۔ جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہو گا۔ دنیا و آخرت میں آبرومند اور مقربین میں سے ہو گا۔ مریمؑ کہنے لگیں۔ میرے ہاں بچہ کیسے ہو گا جب کہ کسی مرد نے مجھے چھوا تک نہیں۔ فرشتوں نے کہا۔ اللہ جو چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ عیسیٰؑ کو کتاب کا علم سکھائے گا۔ تورات اور انجیل سکھائے گا اور وہ بنی اسرائیل کی طرف نبی ہو گا اور ان کے سامنے نبوت کا اعلان کرے گا (۳/۴۲-۴۳)

مریمؑ نے شہر کے پورب میں ایک الگ تھلگ مکان میں تنہائی اختیار کر لی تھی۔ ایک دن آپ کی طرف اللہ نے اپنی روح بھیجی جو ایک اچھے بھلے آدمی کے روپ میں دکھائی دے رہی تھی۔ مریمؑ اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔ اگر تو نیک شخص ہے تو میں تجھ سے اس رحمٰن کے نام پر پناہ مانگتی ہوں۔ جواب ملا میں تمہارے رب کی طرف سے فرشتہ ہوں۔ اور تمہیں ایک پاکیزہ لڑکے کی خوشخبری دیتا ہوں۔ مریمؑ نے کہا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ مجھے کسی مرد نے چھوا تک نہیں۔ فرشتہ نے کہا اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں ہے۔ اور پروردگار نے فرمایا ہے۔ میں اس کو

کہتے ہوئے کہا، لوگو! میں تمہارے رب کی طرف سے نشانی (وحی) لے کر آیا ہوں جس کی روشن تعلیم اندھی، بہری اور مردہ قوم کو بینا اور درست کر کے زندہ و بلند پرواز کر دیتی ہے۔ اور جو کچھ تم کھاتے پیتے ہو (متمول زندگی کے لیے مادہ ہے) اور جو مال و دولت جمع کر کے گھروں میں رکھتے ہو اسے عیاں کر کے تمہارا محاسبہ کرتی ہے۔ اگر وحی الٰہی پر ایمان رکھنے والے ہو تو اسی کی طرف سے یہ وحی ہے جو تمہارے لئے مبین ہدایت ہے۔ اور مجھ سے پہلے (جو وحی) تورات نازل ہوئی اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ اور بعض چیزیں جو تم پر حرام تھیں انہیں حلال کرنے آیا ہوں۔ اللہ سے ڈرو اور اس کی وحی پر ایمان لاؤ جس کے سوا زندگی کا سیدھا راستہ پانے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ اور سن لو کہ میرا اور تمہارا پروردگار اللہ ہے۔ فقط اس کی عبودیت اختیار کرو، اشارہ شرک سے باز رہنے کا ہے۔ ([illegible])

عیسیٰؑ کو فرضِ رسالت پورا کرتے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا۔ لیکن آخر کار جب دیکھا کہ آپؑ کی تبلیغ کا لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ شدید مخالفوں کا سامنا ہے تو ان سے کہا، کیا تم میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو میرا اور اللہ کا مددگار ہو؟ چند لوگ (حواری) کہنے لگے ہم ایمان لانے والے ہیں اور اللہ کے مددگار ہیں اور آپؑ گواہ رہیں کہ ہم فرمانبردار ہیں۔ پھر اللہ کی طرف متوجہ ہو کر دعا کرنے لگے اے اللہ! ہم تیری وحی پر ایمان لائے اور تیرے پیغمبر کے تابع ہوئے۔ تو ہمیں شاہدوں میں لکھ لے ([illegible])

حواریوں نے زبان سے ایمان لانے کا اظہار کیا لیکن ان کے دل روشن نہ تھے۔ کہنے لگے۔ اے عیسیٰؑ بن مریمؑ! کیا تمہارا رب ہم پر آسمان سے خوان نازل کر سکتا ہے؟ عیسیٰؑ نے کہا، تعجب ہے کہ ایمان لانے کے بعد ایسا مطالبہ کرتے ہو اللہ سے ڈرو۔ حواری کہنے لگے۔ ہمارا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم

اُدھر مقدس سرزمین (فلسطین) تقدس لیئے ہمیشہ کے واسطے بعثت کو ترسنے کے لیئے رہ گئی۔ اِدھر سرزمینِ حجاز آمد و بعثت کو ترسنے لگی۔

آگے بڑھنے سے پہلے اذکارِ انبیائے کرام میں علم و حکمت اور ہدایت کو تلاش کرنا ضروری ہے۔ یہ قصے کہانیاں نہیں ہیں۔ قرآن (کا ہر لفظ، جملہ اور آیت) اپنے اندر علم و حکمت اور ہدایت کے ذخیرے لیئے ہوئے حق کے متلاشی کو تاقیامت دعوتِ جستجو دیتا رہے گا۔ اختصار کے پیشِ نظر انبیائے کرام کے اذکار کی چند باتیں اخذ کر کے بیان کی جاتی ہیں۔

۱ — نبوت وہبی ہے کسبی نہیں ہے۔ نبی کا انتخاب قدرت خود کرتی ہے۔ رہبری کے لیئے اگر ہر انسان اپنے اوپر نزولِ وحی کا خواہشمند ہو تو جمادات و نباتات و حیوانات و دیگر مخلوق اور انسان میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔

۲ — نزولِ وحی کی ماہیت کو نبی جانتا ہے یا اللہ کو معلوم ہے۔ وحی کی تعلیم جو چاہے حاصل کر سکتا ہے۔

۳ — کسی کو وحی پر ایمان لانے کے لیئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ایمان نہ لانے والے کو رد یا خارج از دین کیا جا سکتا ہے۔

۴ — غیب کا علم کوئی نہیں جانتا (سوائے اللہ کے) حتیٰ کہ نبی بھی اس سے واقف نہیں ہوتا۔

۵ — کوئی کسی کی قسمت بذریعہ کرامات نہیں بدل سکتا۔ قسمتیں وحی پر ایمان و عمل سے بدلتی ہیں۔

۶ — سچے نبی کا واحد ثبوت ذاتی اغراض سے بے نیازی ہے۔

۷ — وحی کی بنیادی تعلیم توحید پرستی ہے۔

۸ـــ مذہب نسل در نسل وراثت سے منتقل ہوتا ہے۔ دین بذریعہ وحی بوساطت نبی عطا ہوتا ہے۔

۹ـــ راہبرِ انسانیت ہر مزاحمت کے سامنے اپنے موقف پر جما رہتا ہے۔ نہ مایوس ہوتا ہے نہ پیچھے ہٹتا ہے۔

۱۰ـــ وحی کی تعلیم دلائل و براہین سے دی جاتی ہے۔

۱۱ـــ انسان کا انسان سے حقیقی رشتہ فقط دین کا ہے۔ باقی تمام رشتے باطل ہیں۔ گرچہ خونی رشتے ہی کیوں نہ ہوں۔

۱۲ـــ کوئی منکرِ وحی قوم کتنی ہی (مادی لحاظ سے) ترقی یافتہ اور طاقتور کیوں نہ ہو۔ اسے مہلت تو مل سکتی ہے لیکن آخرالامر تباہ ہو جاتی ہے۔

۱۳ـــ لوگوں کا یہ اعتراض دائم و قائم ہے کہ پیغمبرِ خدا بشر کیسے ہو سکتا ہے یا دوسرے الفاظ میں بشر پیغمبرِ خدا کیسے ہو سکتا ہے!

۱۴ـــ راہِ حق سے منہ پھیرنے والوں کو تاریخی حقائق سے نصیحت لینی چاہیئے۔

۱۵ـــ باطل جب حق کے استدلال سے لاجواب ہو جاتا ہے تو ترشی و تشدد پر اتر آتا ہے۔

۱۶ـــ گمراہ قومیں اخلاقی طور پر کم و بیش زندگی کے ہر گوشے میں آلودہ ہوتی ہیں۔ اور جب کسی قوم میں ایک سنگین جرم (گناہِ عظیم) انتہا تک پہنچ جاتا ہے تو وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے اور اس کا نام و نشان دنیا سے مٹ جاتا ہے۔

۱۷ـــ حسد فسادِ زندگی کی ایک جڑ بنیاد ہے۔

۱۸ ــــ نفس امارہ انسان کو برائی کی طرف مائل کرتا رہتا ہے (شیطان نے مہلت لے رکھی ہے) لیکن جب تک فعل بد سرزد نہ ہو انسان کو مجرم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

۱۹ ــــ سیرت و کردار کی عظمت پر بہتان و تہمت کے کتنے ہی پردے کیوں نہ ڈالے جائیں وہ نمایاں ہو کے رہتی ہے۔

۲۰ ــــ جو لوگ خوابوں کی دنیا میں رہ کر بے عمل ہوتے ہیں تقدیر ان کی ہمنوا نہیں بنتی۔

۲۱ ــــ نیک ارادے سے "کسی برائی کا ارتکاب" حقیقت میں بدی نہیں ہے۔

۲۲ ــــ اللہ کسی کے اعمال کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

۲۳ ــــ عدل زندگی کا محور ہے۔

۲۴ ــــ عہد باندھ کر اس سے پھر جانا شیوۂ مرد خدا نہیں ہے۔

۲۵ ــــ بلند کردار لوگ نہ امانت میں خیانت کرتے ہیں نہ احسان ناآشناس ہوتے ہیں۔

۲۶ ــــ کسی کی محنت رائیگاں نہیں جاتی۔

۲۷ ــــ ایمان کہیں ہو تو عصائے موسوی ہے جو اژدھا بن کر فرعونی سانپوں کو نگل جاتا ہے۔ سمندروں کو پھاڑ دیتا ہے۔ پتھر سے چشمے بہا دیتا ہے۔

۲۸ ــــ قحط اور طوفان اور پھلوں کا نقصان اور ٹڈی دل اور جوئیں اور مینڈک اور ایسے دیگر حشرات الارض کی کثرت عذاب الٰہی ہیں جو گمراہ قوموں کے لئے باعث نصیحت ہیں۔

۲۹ ــــــ قوم میں تفریق و انتشار بت پرستی سے بھی بدتر ہے۔

۳۰ ــــــ "نقش پائے رسول سے مٹی بھر خاک لے کر" صورتیں بنانے والے مشرک ہیں اور دوسروں کو بھی شرک میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

۳۱ ــــــ انسان بے یقینی اور عدمِ استقلال کے سبب نقصان اٹھاتا ہے۔

۳۲ ــــــ تمسخر کرنا گھٹیا پن اور جہالت کی علامت ہے۔

۳۳ ــــــ مادی لحاظ سے طاقت کم ہی کیوں نہ ہو ایمان کی پختگی شیطانی قوت پر غلبہ رکھتی ہے۔

۳۴ ــــــ انقلاب راز دان بزرگوں کی رہبری سے ایمان سے سرشار جوانوں کے ہاتھوں برپا ہوتا ہے۔

۳۵ ــــــ اقتدار کے نشے میں انصاف کو بھول جانا اللہ کے بندوں کا شیوہ نہیں ہے۔

۳۶ ــــــ انسان کی مادی زندگی میں عروج و زوال کا سلسلہ عرصہ دراز سے چلا آرہا ہے۔

۳۷ ــــــ تمام نعمتیں اللہ کی عطا کردہ ہیں۔ انسان کو ان پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیئے۔

۳۸ ــــــ زمین پر مسلط ہو کر اللہ کی حکمرانی قائم کرنے کے لیئے "روحانی علمت" کے ساتھ مادی ارتقاء کی ضرورت بھی لازمی امر ہے تاکہ تختِ سبائی تختِ سلیمانی کے قدم چومنے پر مجبور ہو جائے۔

۳۹ ــــــ "تختِ سلیمانی" کے وارث ناکارہ و ناتوان "بے جان دھڑ" ہوں تو شیطانی قوتیں آزاد ہو کر موجبِ فساد بن جاتی ہیں۔

۴۰۔۔۔ اندھی، ابرص اور مردہ قوموں کو صحت مند اور زندہ کرنے کے لیئے "مسیحائی" وحی کی پیروی ہی سے ممکن ہے۔

ختمِ نبوّت

حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہہ دیا تھا: میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تورات کی تصدیق کرنے آیا ہوں اور تمہیں ایک رسول کی خوشخبری دینے کے لیے آیا ہوں جس کا نام احمدؐ ہوگا۔ اس سے واضح ہے کہ بعثت کا سلسلہ بنی اسرائیل میں ختم ہو کر بنی اسمٰعیلؑ کی طرف منتقل ہوگیا۔ اور ظاہر ہے کہ عیسیٰؑ کے بعد بعثتِ ختم المرسلینؐ تک کے درمیانی عرصہ میں کوئی نبی نہیں آیا۔

تعجّب ہے کہ "ختمِ نبوّت" کا مسئلہ بڑے عرصہ سے زیرِ بحث و تکرار چلا آ رہا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی متنازعہ فیہ مسئلہ سرے سے نہیں ہے۔ وحیٔ آخر (قرآن) اس پر خود شاہد ہے اور دلائل درج ذیل ہیں، ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) ــــ سب سے پہلے نبوّت کے معاملہ میں حفاظتِ نسل کی شہادت جو قرآن سے ملتی وہ قابلِ غور و فکر ہے۔ (خیال رہے کہ غیر از نبی دیگر انسانی مخلوق میں نسل و رنگ کے لحاظ سے کوئی ادنیٰ یا اعلیٰ نہیں ہے۔ یہ محض ایک دوسرے کی پہچان کے لیے ہیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کا معیار حُسنِ سیرت و کردار ہے) ۔ $(\frac{۴۹}{۱۳})$

عیسیٰؑ کی ازدواجی زندگی ثابت نہیں ہے اور آپؑ کی مذکورہ بالا پیش گوئی بیّن دلیل ہے کہ بنی اسرائیل کی نسل میں بعثت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اور پھر قرآن نے ختمِ نبوّت کا واضح اعلان کر دیا کہ "محمدؐ تم مردوں میں سے

کسی کا باپ نہیں ہے اور خاتم النبیین ہے۔" (۳۳/۴۰) علاوہ ازیں نبوت کے معدن میں حفاظتِ نسل کی شہادت کے لیے مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں۔

"بلاشبہ اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور عمرانؑ کے خاندان کو دنیا بھر کے لوگوں میں برگزیدگی عطا فرمائی۔"
(۳/۳۲)

"اللہ نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو رسول بنا کر بھیجا اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب کو جاری رکھا۔ ان کی نسل میں ہدایت یاب بھی ہیں اور اکثر ان میں فاسق ہیں۔" (۵۷/۲۶)

"اے بنی اسرائیل! تم ان لوگوں کی نسل سے ہو جن کو نوحؑ کے ساتھ ہم نے کشتی میں سوار کرایا تھا اور نوحؑ شکر کرنے والا بندۂ خدا تھا۔" (۱۷/۳)

ابراہیمؑ کے ذکر میں آپؑ کی دعا کے الفاظ پلٹ کر دیکھیے (۲/۱۲۴)

"ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ اور یعقوبؑ بخشے گئے جو اللہ کے پیغمبر تھے۔ ان سے پہلے نوحؑ نبی تھے۔ اور ان کی اولاد میں سے داؤدؑ اور سلیمانؑ اور یوسفؑ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ اور زکریاؑ اور عیسیٰؑ اور الیاسؑ اور اسمٰعیلؑ اور الیسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ سب اللہ کے رسول تھے اور ان کے باپ دادا اور اولاد اور بھائیوں میں سے بعض کو نبوت عطا ہوئی اور ان سب کو کتاب اور نبوت اور حکمت عطا ہوئی۔" (۶/۸۵ ـ ۹۰)

۲ ـــــ دوسری دلیل یہ ہے کہ نبوت اور کتاب لازم و ملزوم ہیں۔ مندرجہ بالا آیات (۶/۸۵ ـ ۹۰، ۵۷/۲۶) اس پر شاہد ہیں اور اس دلیل کے حق میں مزید

آیات درجِ ذیل ہیں۔

"آغاز کار سب لوگ ایک دین پر تھے۔ پھر جب ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوا تو اللہ نے پیغمبر بھیجے کتاب کے ساتھ ...... (٢/٢١٣)

"کسی بشر کا کام نہیں کہ اللہ اُسے نبوت اور کتاب اور حکمت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے عبد بن جاؤ... (٣/٧٩)

"(اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم تجھ سے پہلے مردوں کو ہی پیغمبر بنا کر بھیجتے رہے جن پر وحی نازل کرتے تھے۔ اگر لوگ نہیں جانتے تو وحی کے پیروں کاروں سے پوچھ لیں۔ ہم نے ان پیغمبروں کو روشن ادلہ اور کتابیں دے کر بھیجا تھا اور تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے .. (١٦/٤٣-٤٤)

"ہم نے نشانیاں دے کر اپنے رسول بھیجے ہیں کتاب و میزان کے ساتھ تاکہ لوگ عدل کی زندگی قائم کریں"..... (٥٧/٢٥)

٣ ـــــ نبی کے لیے وحی کو سینے میں چھپا کر رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ وحی کا نزول نسل انسانیت کی رہبری کے واسطے ہو رہا تھا اس کو لوگوں تک پہنچانا اسی صورت ممکن تھا کہ وحی کو لفظ بہ لفظ محفوظ کیا جائے۔ اور اس کے لیے دو ہی طریقے ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ وحی کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے (بہ تحریر یا تختیوں پر یا پتھر پر یا پتوں پر یا کپڑے پر یا کاغذ پر ــــ) دوسرا طریقہ حفظ کرنے کا ہے جو قرآن کے لیے مختص ہے کیونکہ اس سے پہلے کسی آسمانی کتاب کو حفظ کرنے

کی شہادت تاریخ میں نہیں ملتی دوسرے یہ کہ قرآن سے پہلے تکمیلِ وحی ممکن نہ تھی اس لیئے کہ حیاتِ کائنات کے تقاضے ابھی تشنۂ معراج تھے۔

۴ــــ قرآن سے پہلے کسی کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے نہیں لیا۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لے رکھا ہے (۱۵/۹) معراج کی طرف بڑھتے ہوئے ادوار میں وجدانی تقاضوں کا حل (بصورت وحی) ملتا رہا۔ جو مکتوب تھا یا مکتوب کیا جاتا رہا۔ ایک نبی کے دور کے بعد لوگ کتاب اللہ میں تحریف اور ردّ و بدل کر دیتے۔ دین کی اصل صورت زیرِ حجاب ہو جاتی اور اس کی جگہ مذہب وجود میں آجاتا۔ نبی بعثت ہوتی۔ لوگ پھر اپنی شیطانی خصلت کو ابھار کر دین کی صورت بگاڑ دیتے اور مذہب ایجاد کر لیتے۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہا اور زمین اللہ کے دین سے محروم ہو کر مذاہب سے گراں بار ہوتی رہی یہاں تک بعثت خاتم النبیین ہوئی اور وحی (قرآن) کو حفظ کرنے کا ذوق دل میں ڈال دیا گیا اور اس طرح وحی آخر کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لے لیا۔ اگر قرآن کے بعد سلسلۂ وحی جاری رہنا ضروری ہوتا تو اس کی حفاظت کا ذمہ (تا قیامت) اللہ نے نہ لیا ہوتا۔

۵ــــ انسانی عقل تجرباتی طریق سے وقت کے تقاضوں کے مطابق نظریۂ زندگی بدلتی رہتی ہے اور مختلف عقلوں کے نظریات آپس میں متصادم ہو کر باعثِ انتشار و فساد ہوتے رہتے ہیں۔ وجدان (عقل کی بلند کیفیت) زندگی کو فساد سے بچا کر اسے اپنی حقیقی عظمت کی طرف لوٹانے کے لیئے عقلِ کل سے تقاضوں کا حل طلب کرتا ہے جو زمانے کی ٹھوکریں کھانے سے بے نیاز ہے ورنہ عقلِ انسانی اور عقلِ کل میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ حیاتِ کائنات وجدانی طور پر اپنے تقاضوں کا حل طلب کرتی رہی اور جب اپنے معراج کو پہنچی،

تو اس کے حتمی تقاضوں کا حل بیک وقت (بصورت قرآن) آگیا۔ معراجِ انسانیت کے بعد نہ تقاضے باقی رہے نہ وحی کی ضرورت رہی۔

۲ ـــــ ختمِ نبوت کے بعد دعویٔ نبوت کا جواز پیدا کرنے کے لیے اگر یہ دلیل دی جائے کہ قرآن نے صرف تین کتابوں تورات، زبور اور انجیل کا ذکر کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سب نبیوں پر کتاب نہیں اتری تو یہ قطعی طور پر بے بنیاد دلیل ہے (جس کا موزوں جواب اوپر دیا جا چکا ہے ـــــ تاہم مزید وضاحت کرنے میں مضائقہ نہیں)۔

انبیاء کرام کی صحیح تعداد نامعلوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مبعوث ہوئے۔ بہرحال قرآن نے جس طرح تمام انبیاء کا ذکر نہیں کیا، اسی طرح ہر کتاب کا ذکر کرنا بھی لازم نہ سمجھا۔ قرآن نے صرف ان تین اہم کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔ بنی اسرائیل کو جہان کے لوگوں پر فضیلت دی گئی تھی، مقصود جس سے یہ تھا کہ وہ راہبر انسانیت بنے گی۔ (ابراہیمؑ کے ذکر کو جن الفاظ سے شروع کیا گیا ہے وہ ملاحظہ کریں) لیکن جب منشائے ایزدی کے برعکس ثابت ہوئی تو یہ ذمہ داری ان سے چھین کر سرزمینِ عرب میں بسنے والی قوم کے سپرد کر دی گئی (جہاں بنی اسرائیل ہی کے آبا، ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ جا بسے تھے جن کی نسل سے ختم المرسلینؐ پیدا ہو کر مبعوث ہوئے) اس کے باوجود بنی اسرائیل کی اہمیت موجود رہی (جو قرآن سے ثابت ہے) اور جس سے آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ـــــ اگر اللہ لوحِ محفوظ رکھتا ہے جس میں ہر چیز اور عظیم المرتبہ و عظیم الشان قرآن بھی مکتوب ہے (۵۶/۷۸ - ۸۵/۲۱-۲۲) تو کتاب کے بغیر نبوت کا دعویٰ مضحکہ خیز ہے۔

۸۔ ____ چودہ صدیوں میں کوئی دشمن دین قرآن میں تحریف یا ردو بدل نہیں کر سکا۔ اگر وحی بحفاظت موجود ہے تو نبوت کا دعویٰ کرنے والا لوگوں کے سامنے کیا پیش کر کے خود کو نبی ثابت کرے گا؟

حق کے شناساؤں کو یقین محکم ہے کہ قرآن تا قیامت لفظ بہ لفظ محفوظ رہے گا۔ حافظِ قرآن کاتبِ قرآن پر مسلط ہے اس لیے کسی ملعون کی اس میں تحریف یا ردو بدل کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن خاتم النبیین کے شیدائیوں کو جنونِ عشق میں سنبھل کر یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ اس کا ماحصل کیا ہے؟ کیا ختمِ نبوت کو ثابت کر لینے سے وحی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے اور اُمتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے فرائض سے سبکدوش ہو کر فارغ ہو جاتی ہے؟ مسلمانوں کو کیا یہ معلوم نہیں ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد وحی کے مقصد کو پورا کرنے کی ذمہ داری خود ان پر عائد ہوتی ہے؟ قرآن نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ ساری اُمت کتاب اللہ کی وارث ہے $(\frac{۳۵}{۳۲})$۔

محسنِ انسانیت کی محبت اور اس پر جاں نثاری کا جذبہ قابلِ قدر و ستائش ہے مگر اُمت میں اُسوۂ حسنہ کی جھلک تک نہ دکھائی دے، زمین پر کفر و شرک غالب و مسلط ہو اور انسانیت امن و سلامتی کو ترستی پھرے تو یہ حسین خود فریبی میں مبتلا ہو کر اللہ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فریب دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اگر اُمت کے دل میں پیغمبرِ خدا کے لیے صحیح جذبۂ ایثار ہے اور آپ سے محبت ہے تو اس کا ثبوت وحی یہ طلب کرتی ہے کہ اُمت اللہ کے احکام کی بالکل اسی طرح پیروی کرے جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔ اور یہی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے جس کا حکم قرآن نے دیا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم

زندگی بھر ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کی جدوجہد کرتے رہے جو فساد اور آلودگیوں سے پاک ہو کر ارتقاء پذیر ہو اور جس میں ہر فرد کو زندگی کے صحیح نصب العین کو حاصل کرنے کے واسطے سازگار ماحول میسر رہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد کے نتیجہ کی تاریخ شاہد ہے۔ مابعد یہ ذمہ داری اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد ہوتی ہے اور اُمت کے حال پر صدیوں سے آسمان آنسو بہا بہا کر دورِ محمدی کی اُمید میں زمین کو تازہ رکھنے کے لیے شاداب کرتا آرہا ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو وہ شمع ہیں جو اللہ کے نور سے منور ہے۔ پروانے جس شمع کے گرد کاٹتے ہیں وہ مرتے روشنی پر ہیں۔ افسوس! کہ پروانے شمع کے سائے میں چھپی ہوئی اُن "چھپکلیوں" سے غافل ہیں جو ان کو نگل جاتی ہیں۔

اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پروانوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنا ہے۔ اُسوۂ حسنہ کی تقلید کرنی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا ثبوت بہم پہنچانا ہے تو انھیں اپنی حالتِ زار کا احساس کرتے ہوئے سب سے پہلے اُن "چھپکلیوں" سے نجات حاصل کرنی چاہیئے جو گرتے ہوؤں کو تھامنے کی بجائے "نگل جاتی" ہیں۔

اُمت کے ہر فرد کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ خود قرآن کا مطالعہ غور و فکر سے کرے اور ساتھ ساتھ اللہ کے احکام و ہدایت پر عمل پیرا ہوتا جائے۔

چونکہ صدیوں سے سادہ دل لوگوں کے پاکیزہ جذبات کا فائدہ اٹھانے والوں نے انھیں سحر زدہ کر کے غلط راہ پر ڈال دیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے قرآن کی اُن آیات کی طرف خاص توجہ مبذول کرائی جائے جن سے ذہنوں پر

پڑا ہوا غبار اتر جائے۔

ارشاد ہے:

"بنی اسرائیل (یہود و نصاریٰ) نے دین میں تحریف اور ردّ و بدل کر کے دین کو چھوڑ کر یہودیت اور نصرانیت (مذاہب) ایجاد کر لیے اور برملا کہتے ہیں کہ وہ راہِ راست پر ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے مذاہب میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ حالانکہ ان سب کا باپ ابراہیمؑ توحید پرست تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا" (۲/۱۳۵، ۲/۱۴۰)۔

"یہودی کہتے ہیں عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ اللہ انھیں ہلاک کرے یہ بھی اپنے سے پہلے کافروں کی طرح خرافات میں پڑ گئے ہیں۔ وہ اپنے علماء و مشائخ کو بھی انھوں نے الٰہ ٹھہرا لیا ہے۔ حالانکہ ان کو صرف اللہ کو معبود ماننے کا حکم دیا تھا۔ اللہ ان کے شرک سے پاک ہے" (۹/۳۰-۳۱)۔

"وہ لوگ کافر و مشرک ہیں جو کہتے ہیں کہ مسیح ابنِ مریم ہی اللہ ہے اور تثلیث کے قائل ہیں۔ ایسے لوگوں پر جنت حرام کر دی گئی ہے" (۵/۷۲-۷۳)۔

"(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے لیے بھی وہی دین مقرر کیا گیا ہے جس کا نوحؑ و ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تھا۔ اور ان کو ہدایت کی گئی تھی کہ دین کو مضبوطی کے ساتھ قائم کرنا اور اس میں پھوٹ نہ آنے دینا۔ (اور یہی حکم اب تمھارے لیے ہے)۔

(۴۲/۱۳)۔

(اے محمدؐ! اپنی اُمت سے کہہ دے) تم بھی کہیں ان مشرکین جیسے نہ ہو جانا جنھوں نے دین (چھوڑ کر مذہب ایجاد کر لیا اور آپس) میں پھوٹ ڈال کر مختلف فرقوں میں منقسم ہو گئے اور ہر فرقہ خود کو بزعم خویش، ناجی سمجھتا ہے" (۳۰/۳۱-۳۲)، "جو لوگ واضح احکام ملنے کے بعد فرقوں میں منقسم ہو گئے ان کے لیئے بڑا عذاب ہے" (۳/۱۰۵) اور "ان سے کہہ دے میں تمہارے جیسا ایک بشر ہوں اِلّا یہ کہ مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی ہوئی ہے۔ تمہارا معبود فقط اللہ ہے۔ سو جو شخص اپنے پروردگار سے ملنے کی اُمید رکھتا ہے اُسے چاہیئے کہ وہ صرف اللہ کی عبودیت اختیار کرے اور اس میں کسی کو شریک نہ بنائے" (۱۸/۱۱۰) "میں اس خالق و مالک کے سوا کسی کا حکم ماننے والا نہیں ہوں۔ میں شرک نہیں کر سکتا" (۶/۱۴) "قرآن میرے لیئے واحد ہدایت ہے اور میں شاہد ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی دیگر اِلٰہ نہیں ہے (اگر تم شرک کرو گے تو) میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں" (۶/۱۹) "میرا ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں جنھوں نے دین میں مختلف راہیں نکال لیں اور فرقوں میں بٹ گئے

(۶/۱۵۹)۔

مندرجہ بالا آیات سے صاف ظاہر ہے کہ فرقہ بازی جو خود ساختہ مذہب سے پیدا ہوتی ہے شرک ہے اور اس میں وہی قوم مبتلا ہوتی ہے جو وحی پر ایمان لانے کے بعد اس میں تحریف اور ردّ و بدل کر کے یا اسکے

معنی و مفہوم کی من مانی تاویلیں کر کے دین کو پس پشت ڈال کر "مذہب" ایجاد کر لیتی ہے۔

شرک کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے ——— "لوگوں کی اکثریت اللہ پر ایمان نہیں لاتی مگر اس کے ساتھ شریک ٹھہرا کر" $(\frac{۱۳}{۱۰۶})$ لوگوں کو تنہا اللہ کی طرف بلایا جاتا ہے تو منہ پھیر لیتے ہیں اور اگر اس کے ساتھ شریک ٹھہرا کر بلایا جائے تو بھاگتے چلے آتے ہیں" $(\frac{۴۰}{۱۲})$ اور "کہتے ہیں کہ یہ شریک ہی تو ہمارے نفع و نقصان کے مالک ہیں جن کی ہم پرستش کرتے ہیں اور یہ اللہ کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں $(\frac{۱۰}{۱۸})$" "قربِ خداوندی کے لیے وسیلے بنا کر ان کی پوجا کرنا شرک ہے" $(\frac{۳۹}{۲})$ "شیطان کا زور توحید پرستوں پر نہیں چلتا بلکہ شیطان دوست مشرکوں پر چلتا ہے" $(\frac{۱۶}{۱۰۰-۹۹})$ "تمام اعمال (کتنے ہی خوشنما اور سودمند کیوں نہ ہوں) شرک سے ضائع ہو جاتے ہیں" $(\frac{۳۹}{۶۵})$ شرک ناقابلِ معافی گناہ ہے اس کے سوا اللہ جس گناہ کو چاہے بخش دے" $(\frac{۴}{۱۱۶} \cdot \frac{۲۱}{۳۲-۳۰۰})$۔

مندرجہ بالا تمام آیات کے ہر لفظ اور جملے پر غور کیجیے اور اللہ پر ایمان لانے والے مسلمانوں کا تجزیہ کیجیے۔

"جن دلوں میں اللہ کی سی محبت کسی اور کے لیے ہے۔ وہ عذاب سے نہیں بچ سکتے" $(\frac{۲}{۱۶۵})$۔

بس قوتِ نامحدود کا عشق (انسان) کو نہ ہو تو کسی محدود کا عشق اُسے نامحدود کے قریب نہیں لے جا سکتا۔ قربِ الٰہی (عرفانِ حق) اسی کو نصیب ہو سکتا ہے جس کے دل میں فقط اللہ کا عشق موجزن ہو محدود کو محدود کا عشق یک محدود مقام پہ محدود کر دیتا ہے۔

خاتم النبیین کی پیروی کرنی ہے تو پہلے اللہ کے عشق سے لبریز محمدؐ کا سا دل پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ختمِ نبوت کا بوجھ اٹھانے سے پہلے اپنے باطن میں نگاہِ عمیق سے جھانکیے۔ قلب کا جائزہ لیجیے۔ اگر دل میں اللہ کے سوا کسی اور کا عشق غالب ہے تو مسیرتِ حیات کے لیے جو قدم اٹھے گا غلط سمت کی طرف اٹھے گا۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

دین کے پانچ ستون

ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ ایمان (کلمہ)، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اسلام کے پانچ بنیادی ستون ہیں جن پر دین کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ عقیدہ کے درست ہونے میں شبہ نہیں ہے لیکن باوجود اس کے کہ ایک بھاری تعداد ان ارکان کو پورا کرتی ہے جن نتائج سے مسلمان دوچار ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کا مفہوم جو عام طور پر سمجھا گیا ہے وہ درست نہیں ہے ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ کے بنیادی احکام کی تعمیل ہو اور نتائج مثبت اور تعمیری نہ ہوں۔ خیال رہے کہ کسی عمل کے صحیح یا غلط ہونے کا ثبوت اس کے نتائج سے فراہم ہوتا ہے۔

ہمارے پاس فیصلہ کن امر ہر بات کے لئے وحی ہے۔ ان ارکان کا مفہوم بھی قرآن ہی کی روشنی میں سمجھنا چاہئے۔

ایمان

ماننا۔ تسلیم کرنا۔ اعتماد یا بھروسہ کرنا۔ تصدیق کرنا۔ سچ جاننا سب اس کے معنی میں شامل ہیں۔ جن حقائق پر ایمان لانا فرض ہے ان کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے۔ صحیح راستے پر وہ ہے جو اللہ پر اور آخرت پر اور ملائکہ پر اور انبیاء پر اور کتابوں (وحی) پر ایمان رکھے۔ (۲/۱۷۷، ۴/۱۳۶) لیکن ایمان لانے اور اسلام لانے یا قبول کرنے میں قرآن نے فرق کیا ہے۔ مسلمان گھرانے میں جنم لینے کی، پرورش اور ماحول کے اثر کے یا کسی مصلحت کے سبب اسلام لاکر ایک شخص مسلمان کہلا تو سکتا ہے مگر جب تک اس کے دل میں ایمان

سے روشن نہیں ہوتا وہ مومن نہیں بن سکتا۔ (۴۹/۱۴)

اللہ پر ایمان لانے سے مطلب ہے ایک لامحدود قوتِ غائب کو تمام تر صفات کے ساتھ (جو قرآن میں درج ہیں) تسلیم کیا جائے۔

آخرت پر ایمان تسلسلِ حیات کا یقین ہے۔ اس حقیقت کو دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتار کر تسلیم کرنا کہ موت کے بعد پھر زندگی ہے جس میں دنیا کی موجودہ زندگی کے اعمال کا محاسبہ ہوگا اور کاروانِ حیات ہمیشہ کے لیے رواں دواں رہے گا۔

ملائکہ پر ایمان سے مراد اس امر کا خود اعتمادی کے ساتھ یقین کرنا ہے کہ وہ غیر مرئی کائناتی قوتیں ہیں اور ان میں سے جن کا تعلق انسانی زندگی سے ہے وہ سب انسان کے لیے قابلِ تسخیر ہیں۔

انبیاء اور کتب پر ایمان وحی نبوت پر ایمان لانا ہے۔ اس حقیقت پر ایمان کہ انسان کی راہبری وحی نبوت کے سوا نہیں ہو سکتی جو اب نبی کی رسالت کے بغیر نہیں مل سکتی۔

اللہ، آخرت، ملائکہ اور وحی نبوت پر ایمان کامل ہو تو ایمانیات دعوتِ حرکت پذیر ہو کر تسلسلِ حیات کی راہِ مستقیم پر گامزن کر دیتی ہیں۔ پھر یہ ممکن نہیں کہ مومنین کو استخلاف حاصل نہ ہو اور زمین امن و سلامتی کا گہوارا بن کر "جنت" نہ بن جائے۔ اگر زندگی فساد اور آلودگیوں میں ملوث ہو اور انسانیت امن و سکون اور سلامتی و عدل کو ترس رہی ہو تو ایمان کے دعویداروں کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے۔

نماز

صلوٰۃ کے معنی جو صرف نماز کے لیے جاتے ہیں غلط عام ہیں۔ صلوٰۃ ایک جامع اصطلاح قرآن نے استعمال کی ہے جس میں

مکمل دین سمٹ کر آجاتا ہے۔ الصلوٰۃ دراصل الدین ہے۔ قیامِ صلوٰۃ کا وسیع تر مفہوم دین کو قائم کرنا ہے۔

وحی (قرآن) کی مکمل طور پر پیروی کرنا قیامِ صلوٰۃ ہے۔ (۴۲/۴۳)

تمام فرائضِ منصبی کو پوری طرح سے ادا کرنا قیامِ صلوٰۃ ہے۔ (۵۷/۱۰-۲۶ — ۲۳/۴۱)۔

وحی کی تعلیم کے مطابق تمام امور کے فیصلے کرنا قیامِ صلوٰۃ ہے (۵/۱۰۰ — ۴۲/۳۸)۔

ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا جو نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کا حامل ہو۔ جس میں ہر فرد کی پرورش ہو اور اس کو تزکیۂ نفس کے مواقع میسر ہوں۔ اور اس معاشرے میں سے تمام برائیوں کو مفقود کر دینا اور خیر و حسنات کے کاموں کو جاری کرنا قیامِ صلوٰۃ ہے۔ (۲۲/۴۱)۔

گویا قیامِ صلوٰۃ دین کو مکمل طور پر قائم کرنا ہے۔ جس میں نماز کی پابندی کے ساتھ ادائیگی بھی شامل ہے۔

دراصل نماز مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے مقصود بالذات نہیں ہے۔ نماز کی حقیقت و اہمیت کو غور سے سمجھیں۔

اسلام ایک عسکری دین ہے۔ مسلمان اللہ کے مجاہد سپاہی ہیں اور زمین ان کے لیے ایک معسکر کی طرح ہے۔ جس طرح (آپ کے مشاہدے میں ہے) فوج کے ہر سپاہی کے لیے مسلسل عسکری تربیت لازمی ہے تاکہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے واسطے ہر وقت پوری طرح سے تیار رہے۔ اسی طرح اللہ کے ہر مجاہد کے لیے مسلسل تربیتِ نفس ضروری ہے تاکہ وہ بڑی شیطانی قوت کے مقابلے کے لیے مکمل طور پر تیار رہے۔ قرآن میں نمازِ تہجد کا حکم اسی پر

شاہد ہے۔

نماز کے اوقات متعین کرتے ہوئے اللہ اپنے پیغمبر کو ہدایت فرماتا ہے۔ (اے محمدؐ) ان نمازوں کے علاوہ رات کے کچھ حصہ میں بیدار ہوا کرو۔ یہ تمہارے لیئے زائد نماز ہے جو تمہیں مقامِ محمود میں داخل کرے گی۔ (۱۷/۷۸-۷۹) اے محمدؐ! جو کپڑوں میں لپٹے ہوئے (سو رہے) ہو رات کو بیدار ہوا کرو۔ رات کے تھوڑے حصے میں نصف رات یا کچھ کم و بیش، اور قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔ ہم تم پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے۔ درشب بیداری یقیناً نفس پر خوب طرح اثر انداز ہوتی ہے اور اللہ کی طرف ذہن میں یکسوئی پیدا ہوتی ہے۔ دن کی مصروفیات میں ایسا نہیں ہو سکتا سو رات کے ان حصوں میں اپنے رب کی طرف کامل رجوع کیا کرو۔ (۷۳/۱-۸)۔

اگر کوئی یہ سمجھے کہ نمازِ تہجد کا حکم صرف پیغمبرِ خدا کے واسطے تھا تو یہ ایک بہت بڑا اور دور رس نتائج کے حامل حکم سے گریز کا جواز پیدا کرنا ہے۔ گویا خود کو خدا تک عرفان کی کوشش سے دور کر کے حصولِ نصب العین سے محروم رکھنا ہے۔ بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لیئے پیغمبر جیسی ہستی کو شب بیداری و رجوع سے تربیتِ نفس کی ضرورت تھی تو کیا پیغمبر کی خاکِ پا کے برابر امت کو تربیتِ نفس کی ضرورت نہیں ہے؟ یقیناً ہے اور قرآن میں اس کی طرف صاف اشارات موجود ہیں۔ ارشاد ہے —— جنت کے وارث وہ لوگ ہیں جو رات کے تھوڑے حصے میں سوتے ہیں (شب بیدار ہوتے ہیں) اور وقتِ سحر میں مغفرت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ (۵۱/۱۷) —— اللہ کے بندے راتیں اپنے رب کے آگے کھڑے رہتے ہیں اور سجدہ ریز ہوتے ہیں (۲۵/۶۴) ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں اور طلب و خوف میں اللہ کو پکارتے رہتے ہیں (۳۲/۱۵-۱۶) —— پھر ہدایت دیتے ہوئے فرمایا اے محمدؐ!

تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی (پیروکار) قریباً دو تہائی رات یا آدھی رات کبھی تہائی رات قیام کرتے ہو۔ شب و روز کے اندازے رکھنے والے نے معلوم کیا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے تو اس نے تم پر مہربانی سے تمہارے لیے رعایت کر دی کہ جتنا آسانی سے ہو سکے قرآن پڑھ لیا کرو ——— (۷۳/۲۰) شب بیداری کے اوقات میں رعایت تو مل گئی لیکن نمازِ تہجد کا حکم قائم رہا۔

واضح ہے کہ نماز مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے مقصود بالذات نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ نماز سے غفلت برتی جائے۔ پابندی کے ساتھ نماز کی ادائیگی قیامِ صلوٰۃ کا بنیادی جزو ہے ورنہ تربیتِ نفس سے محروم رہ کر شیطانی قوت کا مقابلہ کرنا ممکن ہوتا یا اس کے بغیر تربیتِ نفس کا حاصل کرنا ممکن ہوتا تو یہ فرض، پابندی کے ساتھ عائد نہ کیا جاتا۔ مومنین کے لیے نماز کا مقررہ اوقات میں ادا کرنا فرض کر دیا گیا ہے (۴/۱۰۳) حتیٰ کہ جنگ کی حالت میں بھی (۴/۱۰۲) قضائے نماز کی گنجائش قرآن میں کہیں نہیں ملتی اس سے نماز کی اہمیت ظاہر ہے۔

نماز کے لوازمات کی پابندی بھی ضروری ہے جن کے بارے میں قرآن نے ہدایات وضاحت کے ساتھ دی ہیں:-

نماز ادا کرنے سے پہلے وضو یا بامرِ مجبوری تیمم کرنا لازم ہے۔ وضو کا طریقہ یہ ہے کہ منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھوئے جائیں۔ سر کا مسح کر لیا جائے اور ٹخنوں تک پاؤں دھوئے جائیں۔ جنابت کی حالت میں غسل کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی بیمار ہے یا حالتِ سفر میں ہے یا بیت الخلاء سے ہو کر آیا ہے یا خاوند و بیوی ہمبستر ہوئے ہیں اور طہارت کے لیے پانی میسر نہیں تو منہ اور ہاتھوں کا مسح کر کے تیمم کر لیا جائے (۴/۴۳)۔

نتائج سے آنکھیں چرا کر دامن جھڑا لیا جاتا ہے۔

فرقہ بازی سے بے نیاز توحید پرست مسلم جب اللہ سے سوال کرتا ہے کہ وہ کونسی مسجد میں جا کر نماز ادا کرے تو جواب ملتا ہے۔ جنھوں نے دین کو ضرر پہنچانے کی خاطر مسجد بنائی جو کفر کی طرف لے جاتے اور امت میں تفرقہ ڈالنے کی موجب ہو، اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرنے کی گھات ہو، جس میں قسمیں کھا کر حق پرستی کے جھوٹے دعوے کیئے جاتے ہوں۔ اللہ شاہد ہے یہ سب باطل ہے۔ ایسی مسجد کی بنیاد ہر گز تقوی پر نہیں رکھی گئی۔ رسول اللہ (کی پیروی کرنے والے) ایسی مسجد میں نماز ادا کرتے ہوئے دکھائی نہیں دے سکتے۔

($\frac{9}{108 - 107}$)

نفس پرست لوگوں نے حقیر دنیوی منفعت کے عوض آیات حق کے اصل مفہوم کو زیر حجاب کر دیا ہے۔ اللہ نے سچائی کے ساتھ کتاب نازل کی اور جذبات کے غلاموں نے اس میں اختلاف پیدا کر کے امت میں بھی تفریق و انتشار پیدا کر دیا اور لوگوں کو فرقوں میں منقسم کر کے آپس میں بانٹ لیا۔ انھوں نے ہدایت کے عوض گمراہی کا سودا کیا۔ ایسے لوگ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور بخشش کی بجائے عذاب خریدتے ہیں۔ ایسے ناپاک لوگوں کو بزعم خویش قرب خداوندی کیا حاصل ہوگا۔ قیامت کے دن اللہ ان سے بات تک نہ کرے گا بلکہ دردناک عذاب دے گا جو خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا۔ انھوں نے نماز کو مقصود بالذات بنا کر اپنے پیروکاروں کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ حالانکہ مشرق و مغرب کی طرف منہ کرلینا کوئی نیکی نہیں ہے۔ نیکیاں تو یہ ہیں کہ اللہ اور آخرت اور رسالت اور کتب الٰہی اور

اختلاط ہے اور زکوٰۃ اس کے لیے غذا ہے۔ صلوٰۃ معاشرت ہے تو زکوٰۃ معیشت
ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو زکوٰۃ بھی جزوِ صلوٰۃ ہے جیسا کہ حضرت شعیبؑ کے
ذکر میں آیت (۱۱/۸۷) سے ظاہر ہے لیکن زندگی کے عمل میں ان کی جداگانہ حیثیت
ایک دوسرے پر اثر انداز ہو کر ارتقائے انسانیت کا باعث بنتی ہے (۲۲/۴۱)

قرآن نے ارتقائے انسانیت کے لیے "انفاقِ رزق" کو ایک بنیادی
حیثیت دی ہے۔ انفاقِ رزق کے معنی ہیں رزق کو گردش میں رکھنا خرچ کرنا
(جمع کر کے نہ رکھنا) رزق گردش میں رہے تو کوئی شخص ضروریاتِ زندگی سے
محروم نہیں رہ سکتا۔ اس کے برعکس رزق کو جمع کر کے روک لیا جائے تو معاشرہ
محرومیوں سے بھرپور ہو جاتا ہے۔ انفاقِ رزق سے کسی کی جسمانی پرورش
اور نشوونما ہوتی ہے کسی کی روح کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے۔ جسمانی نشوونما
پا کر ابھرنے والے پھر دوسروں کی جسمانی پرورش کر کے اپنی ذات کا تزکیہ
کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور اس طرح یہ سلسلۂ ارتقائے انسانیت
جاری و ساری رہتا ہے اور فرد اور معاشرہ بلندیوں کی طرف اٹھتا
چلا جاتا ہے۔

تزکیہ اس کا ہوتا ہے جو اپنا رزق اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے
(۹۲/۱۸)۔

کامرانیاں اس کے لیے ہیں جو اپنا رزق اللہ کی راہ میں خرچ کر کے
احسان تک نہیں جتاتا نہ صلہ مانگتا ہے۔ وہ صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ
کرتا ہے (۹۲/۱۹-۲۱) اور کردار کی عظمت اسی میں ہے کہ فی سبیل اللہ خرچ کر
کے احسان تک نہ جتایا جائے۔ (۲/۲۶۲)

اور متقی ہوں تو وہ ہیں جو آسودگی اور تنگی، دونوں حالتوں میں اللہ کی

راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ (۳/۱۳۴)۔

اور فلاح پانے والے وہ لوگ ہیں جو اپنی عزیز ترین چیزوں کو اللہ کی راہ میں دے ڈالتے ہیں۔ (۳/۹۲)۔

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والا حزن و غم سے محفوظ رہتا ہے۔ (۲/۲۷۴) اس کی راہِ حیات آسان ہو جاتی ہے۔ اور بخیل و حریص کی راہِ حیات دشوار ہو جاتی ہے۔ جمع کیا ہوا رزق کسی کو تباہی سے نہیں بچا سکتا (۹۲/۵-۱۱)۔

چند آیات مثال کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ انفاق رزق کے بارے میں ہدایات اور احکامات سے قرآن بھرا پڑا ہے۔

انسانی زندگی میں پرورش، غذا، تندرستی، لباس، تعلیم، رہائش و دیگر لوازمات اور فراہمی قوت کا دارومدار رزق پر ہے۔ انسان کی تخلیقی توانائی بھی رزق ہی کو استعمال میں لا کر زندگی میں حسن پیدا کرتی ہے۔ سو ذاتی اغراض سے بے نیاز ہو کر انسانیت کی ضروریات پوری کرنے اور اس کی صحت و بہبود اور ارتقاء کی نیت سے محنت مشقت سے رزق فراہم کرنا ہر اس شخص کا فرض عین ہے جو اپنی ذات کے تزکیہ کا آرزومند ہے۔

قرآن کا بصورت نظریہ حیات اپنی منفرد خصوصیت کا حامل ہے اور ہونا بھی اسی طرح چاہیے کیونکہ قرآن سب متبادل ضابطوں سے بلند ہے۔ قرآنی معاشرہ قائم ہو یا نہ ہو آیات وحی کسی وقت کسی شخص یا قوم کے تقاضوں کے جواب میں خاموش نہیں ہوتیں۔ غیر قرآنی معاشرے میں اگر کوئی عبد مومن اپنی محنت کی کمائی میں سے اپنی ضروریات سے جو بچ رہے اسے رضاکارانہ طور پر مستحق لوگوں پر خرچ کرلیگا تو یہ ایتائے زکوٰۃ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔ اور اگر قرآنی معاشرہ موجود ہے تو حکومت وقت زکوٰۃ کی شرح مقرر کر کے وصول کرے گی اور اسے اجتماعی بہبود یا اصلاح

وبہبودِ معاشرہ پر خرچ کرے گی تاکہ کوئی فرد ضروریات سے محروم نہ رہ جائے اور
قوم ترقی پذیر رہے (مزید وضاحت زیرِ عنوان "معیشت" دیکھئے)

روزہ

روزوں کا مبارک مہینہ رمضان ہے جس میں نزولِ قرآن ہوا جو
بنی نوعِ انسان کے لیے واضح ہدایت اور فرقان ہے خالق کا اپنی
مخلوق پر یہ بہت بڑا احسان ہے۔ سو اس پر ایمان رکھنے والوں پر فرض عائد
ہوتا ہے کہ رمضان کے پورے ماہ میں روزے رکھیں تاکہ ان کی خودی میں تقویٰ
پیدا ہو۔ اگر کوئی شخص بیماری یا حالتِ سفر کے سبب مجبور ہے تو جتنے روزے
قضا ہوں ان کا شمار بعد میں پورا کرے۔ اور اگر کسی ناگزیر سبب کی بنا پر روزہ
رکھا ہی نہ جا سکتا ہو تو اس کے بدلے کسی محتاج کے کھانے کا بندوبست
(پورے ماہ کا) کر دیا جائے۔ بہتر یہی ہے کہ روزہ رکھا جائے۔ جو نیکی شوق سے
ادا ہو وہ افضل ہے (۲/۱۸۳-۱۸۵)

نماز کی طرح روزہ بھی ایک ایسی نیکی ہے جو باعثِ تربیتِ نفس ہے
اور تربیتِ نفس کے بغیر انسان متقی بن کر نہیں رہ سکتا اور متقی بنے بغیر عرفانِ
حق نصیب نہیں ہو سکتا جو زندگی کا صحیح نصب العین ہے۔ زندگی کا یہ نصب العین
وحی کے ذریعہ سے انسان کو معلوم ہوا ہے۔ اور یہ انسانیت پر اللہ کا بہت
بڑا احسان ہے۔ زندگی وحی سے محروم رہتی تو انسانیت تاریکیوں میں بھٹکتی،
بے خبر فضاؤں میں بے مقصد و بے منزل ٹھوکریں کھاتی ہوئی نابود ہو جاتی۔
سرکشوں کی دنیا میں بھی خیر کا وجود شعوری طور پر وحی کا مرہونِ منت ہے
کوئی نیکی ایسی نہیں ہے جو سوچی جائے یا کی جائے اور وہ وحی میں
موجود نہ ہو۔

حالتِ روزہ میں میاں بیوی کے لیے مباشرت ممنوع ہے۔ روزہ

صرف ایک مثالی کردار دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بن جاتا ہے اور رفتہ رفتہ
مثالی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔ کیا وحی پر ایمان لانے والے ہر فرد پر یہ فرض
عائد نہیں ہے کہ وہ "مثالی کردار" پیش کرے؟

جیسی نہیں یک بیک نکسنے انتظامیں

ہر بگڑے ہوئے معاشرے کی آلودہ حالت قریب قریب ایک جیسی ہوتی
ہے۔ قرآن نے بے مثال حکمت کے ساتھ انسان کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے
اصلاح کا تدریجی طریقہ اختیار کیا ہے۔ اگر کسی مسلم ریاست کو حسنِ اتفاق سے
کوئی مردِ خدا سربراہ نصیب ہو جائے تو اسے بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔
یا کوئی ایسی جماعت وجود میں آجائے جو وحی کی روشنی سے متاثر ہو اور مثالی
معاشرہ کا جذبہ رکھتی ہو تو اسے بھی "انقلابی طریقہ" اختیار کرنے سے گریز کرنا
چاہیئے۔ ماضی و حال شاہد ہیں کہ اس طرح بے شمار جانی و مالی نقصان ہوتا
ہے۔ وہی طریقہ اپنانا واجب ہے جو وحی سے اخذ ہوتا ہے۔ نزولِ قرآن کے
دور کا تاریخی مطالعہ کرتے ہوئے عرب قوم کی بگڑی ہوئی حالت سامنے آتی ہے
آیاتِ وحی کے نزول کا سلسلہ ابتدائی حالت کے مطابق شروع ہوتے ہوئے آخر
تک لوگوں کی بدلتی ہوئی حالتوں کے مطابق اصلاح کرتا چلا جاتا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ کس خوبی کے ساتھ قرآن آلودہ معاشرے کو تدریجاً پستی
سے اٹھا کر بلندیوں کی طرف لے جانے کے لیے افرادِ معاشرہ کے کردار کی اصلاح
کے واسطے ہدایات اور احکام دیتا ہے

ارشاد ہے:—

کتاب اللہ ہر قسم کے شکوک و شبہات سے پاک ہے اور متقین کے
لیے ہدایت ہے۔ متقی لوگ وہ ہیں جو خوفِ زندگی سے خود بھی بچنا چاہتے ہیں اور

دوسروں کو بھی بچانا چاہتے ہیں) جو اس لامحدود قوتِ غائب (اللہ) پر، وحی نبوت پر اور آخرت پر پختہ ایمان رکھنے والے ہیں (۲/۲-۵)۔

جو لوگ کافر ہیں ان کو نصیحت کرنا یا نہ کرنا برابر ہے وہ ایمان لانیکے نہیں۔ ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگ چکی ہے اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ ان کے لیئے تو عذاب فیصلہ شدہ امر ہے۔ لیکن وہ لوگ جو زبان سے تو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر دل ان کے ایمان سے خالی ہوتے ہیں ایسے لوگ منافق ہیں جو بزعمِ خویش اللہ اور مومنین کو دھوکا دیتے ہیں ان کاذبوں کے لیئے دکھ دینے والا عذاب ہوگا۔ یہ منافق لوگ موجب فساد ہوتے ہیں اور جب ان کو فساد سے باز رہنے کو کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں ہم ہی تو صلاح کرنے والے ہیں۔ ان سے مومنین کو ہوشیار رہنا چاہیئے یہ دانستہ فساد کرنے والے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس طرح ایمان لاؤ جس طرح ایمان لانے کا حق ہے تو یہ مکار لوگ کہتے ہیں کیا ہم بھی بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں۔ بظاہر مومنین سے واسطہ رکھتے ہیں اور باطن میں شیطان دوست ہیں گویا دین الٰہی کو انھوں نے ہنسی مذاق بنایا ہوا ہے۔ اللہ انہیں مہلت دیئے جاتا ہے اور یہ شرارت و سرکشی میں پڑے بھٹک رہے ہیں۔ (۲/۶-۱۵)۔

متقین کے پیش نظر صلوٰۃ و زکوٰۃ کو قائم کرنا ہوتا ہے۔ (۲/۳)

ایمان اللہ کے ساتھ عہد باندھنا ہے۔ اس عہد کو توڑنے والے اور ایمان کو ثابت نہ کرنے والے دنیا و آخرت دونوں میں نقصان اٹھانے والے ہیں (۲/۲۷)

حق کی راہ میں بڑی دقتیں ہیں جن کا مقابلہ کرنے کے لیئے ہمت اور صبر و استقلال کی ضرورت ہے۔ اور یہ قوت تربیت نفس نماز سے

حاصل ہوتی ہے۔ (۲/۴۵)۔

احکام الٰہی کی تعمیل مکمل طور پر ہو، جزوی عمل کا نتیجہ دنیا و آخرت دونوں میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (۲/۸۵)، (۲/۲۰۸)۔

زندگی کا صحیح نصب العین عرفانِ حق ہے۔ جو اسی صورت حاصل ہو سکتا ہے کہ اللہ کی صفات کو، بحدِ بشریت، خود میں پیدا کرنے کی کوشش جاری رہے۔ (۲/۱۳۸)۔

دل میں اللہ کی سی محبت کسی اور کے لیے نہ ہو! جو لوگ غیر اللہ کو اس کے شریک ٹھہرا کر ان سے اللہ کی سی محبت رکھتے ہیں۔ وہ ظالم آخر کار عذاب میں داخل ہو کر دیکھیں گے کہ اللہ ہی بہ حقیقت سب طاقتوں کا مالک ہے! (۲/۱۶۵)۔

حلال روزی اور زندگی کے ہر معاملہ میں عدل کو قائم رکھنا سیرت و کردار کی بلندی کا بنیادی ثبوت ہے۔ کسی کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ رشوت دے کر کسی کے ساتھ بے انصافی کرو (۲/۱۸۸)۔

منشیات (شراب، افیون، بھنگ، چرس، تمباکو وغیرہ سب ان میں شامل ہیں) اور جوئے میں ظاہراً کچھ فائدے دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقتاً ان کے نقصانات کہیں زیادہ ہیں۔ اور قرعہ اندازی (شرطیں لگانا اور لاٹری وغیرہ) اور آستانوں پر چڑھاوے چڑھانا اور قربانیاں دینا۔ یہ سب شیطانی اعمال ہیں۔ ان سے بچو شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ ان بد اعمال کے ذریعہ سے تمہیں ایک دوسرے کا دشمن بنائے رکھے اور اللہ کی راہ سے دور رکھے۔ اگر مال ضرورت سے بچ جائے تو بجائے ان شیطانی کاموں میں اللہ کی راہ میں خرچ کر کے قوموں کی ضروریات پوری کرو۔ (۲/۲۱۹) (۵/۹۰)۔

اور تو رزق کو جمع کر کے رکھنا گناہِ عظیم ہے پھر اس پر سود لینا تو گویا اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ (۲/۲۷۹)۔

ان لوگوں نے جذبات و خواہشات کو الٰہ بنا لیا جن کو عورتیں اور بیٹے اور جمع کی ہوئی دولت کے ڈھیر اور مویشی اور کھیتیاں بڑی پُرکشش اور زینت دار دکھائی دیتی ہیں اور ان میں محو ہو کر حقیقت کو بھلائے بیٹھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سامانِ دنیا عارضی ہے اور اللہ کے پاس بہتر ٹھکانا ہے۔ اور تمام نعمتوں کے علاوہ قربِ خداوندی ہے۔ اللہ کے بندے تو وہ ہیں جو کہیں لغزش ہو جائے تو نادم ہو کر مغفرت کے طلبگار ہوتے ہیں اور یومِ حساب کا خوف اُن کے دلوں میں موجود ہوتا ہے۔ راہِ حق پر قدم جمائے رہتے ہیں۔ سچائی کو کسی صورت میں نہیں چھوڑتے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ (۳/۱۴-۱۷)۔

تم محض ادنیٰ اور بے کار چیزیں "خدا واسطے" دے کر اس خوش فہمی میں نہ رہو کہ تم نے نیکی کی ہے۔ جس کی راہ میں جو کچھ دیتے ہو وہ بڑا دانا و بینا ہے۔ جب تک اپنی پسندیدہ چیزیں اللہ کی راہ میں نہ دو گے فلاح نہیں پا سکتے (۳/۹۲)۔

جن لوگوں کو اللہ کا خوف ہو اور بخشش و جنت کی آرزو ہو اور اللہ کی محبت کی تمنا ہو وہ لوگ آسودگی میں کیا تنگی میں بھی اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اللہ ان بندوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں خرچ کرنے والے ہیں، غصے پر ضبط کرنے والے، درگزر کرنے والے ہیں، اپنی لغزشوں کے لیے مغفرت مانگتے رہتے ہیں۔ اور جان بوجھ کر گناہوں کے مرتکب کبھی نہیں ہوتے۔ (۳/۱۳۳-۱۳۵)۔

والدین اور اقربا اور ضرورت مندوں اور رشتہ داروں اور ہمسایوں اور دوستوں اور مسافروں اور اپنے ماتحتوں اور زیر دستوں کے ساتھ احسان کرتے رہو یہی سلوک

سے پیش آؤ۔ نہ تکبر کرو نہ بخل سے کام لو (۴/۳۶-۳۸)۔

امانت میں خیانت نہ کرو۔ (۴/۲۰)، (۴/۵۸) امانتداری بلند کردار کی بنیادی صفات میں سے ہے۔ جو شخص انسان کی چیز میں خیانت کرتا ہے وہ اللہ کی وحی کا امین کس طرح ہو سکتا ہے؟

باہمی میل جول میں ایک دوسرے کو سلام کہو (۴/۸۶) اس طرح ایک دوسرے پر سلامتی بھیجنے سے اخوت، محبت اور اتحاد پیدا ہوتا ہے بشرطیکہ دل میں منافقت نہ ہو۔ اور منافقوں کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے۔ ان کی اصلاح انسان کے بس میں نہیں ہے (۴/۸۸) اپنے گھر جاؤ تو گھر والوں کو سلام کہو (۲۴/۶۱)۔

تہمت تراشی سے بچو۔ اس میں تذلیل انسانیت ہے اور یہ بڑا بھاری گناہ ہے (۴/۱۱۲)۔

ہمیشہ سچ بولو۔ حق کی بات کہو۔ گواہی دینی پڑے تو سچی دو۔ سچائی کے ساتھ عدل کرو۔ کسی صورت کسی معاملہ میں سچائی کو نہ چھوڑو چاہے اس میں خود تمہارا یا تمہارے اپنوں کا نقصان کیوں نہ ہو (۴/۱۳۵)، (۵/۹)، (۳/۵۸)۔

کسی کی پیٹھ پیچھے برائی مت کرو۔ غیبت نہایت ناپسندیدہ اور ذلت آمیز حرکت ہے۔ گویا اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا ہے۔ البتہ اگر تم کسی کے ہاتھوں مظلوم ہو تو اس کا کہیں ذکر کر لینا روا ہے۔ ورنہ کسی کی برائی کو اصلاح کی نیت سے اس کے منہ پر۔ تمسخر، تحقیر، تنابز حقارت (۴/۱۴۸)، (۴۹/۱۲)۔

ابلیس نے تکبر کیا اور راندہ درگاہ ہو کر کافروں میں شامل ہوا (۲/۳۴)۔ تکبر شیطانیت کی پہلی علامت ہے۔ شیطان کے معنی ہی سرکشی کے ہیں۔ جس نے سرکشی کی اس کا مقام جہنم ہے (۷/۱۲-۱۳)، (۳۹/۶۰)۔ شکل و صورت یا جسمانی ساخت پر گھمنڈ کرنا، خاص صلاحیت اور استعداد پر فخر کرنا، مال و دولت یا زور کے سبب

آواز گدھے کی ہوتی ہے۔ اکڑ کر نہ چلو۔ اس طرح نہ تم زمین میں شگاف کر سکتے ہو نہ آسمان تک طویل ہو سکتے ہو۔ گفتار اور رفتار میں اعتدال اور سنجیدگی سے کام لو۔ ان سے برتری اور تکبر کا اظہار نہ ہونا چاہیئے۔ (۳۱/ ۱۸-۱۹) (۲/۱۰)۔

دنیا و آخرت میں اجر خیر اور کامرانیاں ان بلند کردار عورتوں اور مردوں کے لیئے ہیں جو احکام الٰہی کی مکمل طور پر پابندی کرنے والے ہیں۔ حق گوئی جن کا شیوہ ہے محنت و مشقت اٹھانے والے ہیں۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ گناہوں سے بچتے رہتے ہیں۔ بے حیائی کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اللہ کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوتے غصے پر قابو رکھتے ہیں۔ اپنے تمام فرائض منصبی (مع نماز) پوری طرح ادا کرتے ہیں۔ معاملات باہمی مشوروں سے طے کرتے ہیں۔ شیطانی قوتوں کا مقابلہ صبر و استقلال اور بہادری سے کرتے ہیں۔ (۳۳/ ۳۵)، (۴۲/ ۳۷-۳۹)، (۵۲/ ۳۲)۔

بات سیدھی اور صاف کیا کرو (۳۳/ ۷۰)۔

اگر تم میں سے کوئی دو فریق آپس میں جھگڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دیا کرو اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو مظلوم کی مدد کرو اور ظالم پر سختی کرو تاکہ وہ حق کی طرف رجوع کرے (۴۹/ ۹)۔

ایک دوسرے کا تمسخر نہ اڑاؤ۔ نہ ایک دوسرے پر عیب لگاؤ۔ نہ ایک دوسرے کے لئے برے نام رکھو۔ (۴۹/ ۱۱)۔

بدگمانی سے احتراز کرو۔ نہ ایک دوسرے کے بھیدوں کی ٹوہ میں لگے رہو (۴۹/ ۱۲) اس سے خواہ مخواہ دلوں میں نفرت پیدا ہوتی ہے اور فساد کا خطرہ ہے۔

اس حقیقت کو کبھی نہ بھولو کہ تم ایک جوڑے سے پیدا کیے گئے ہو۔ یہ قبیلے، قومیں، رنگ اور نسل محض ایک دوسرے کی پہچان کے لیے ہیں۔ اللہ کے نزدیک قابل عزت و تکریم وہ ہے جس کی سیرت و کردار (کیرکٹر) بلند ہے۔ (۴۹/۱۳)

اگر تم پاک باز ہو تو اس کا فائدہ خود تمہیں کو ہے۔ اپنی پاک بازی کا رعب دوسروں پر نہ جتایا کرو۔ (عملی کردار خود بخود عیاں ہو کر دوسروں پر اثر انداز ہوتا ہے)۔ (۵۳/۳۲)

حرص و ہوا سے بچو ورنہ نامراد ہو جاؤ گے۔ (۵۹/۹) حرص نفس خودی کو پامال کرتی ہے۔ جس دل میں حرص جاگزیں ہو اس میں اللہ کی صمدیت نہیں سما سکتی۔ حرص و ہوا کے غلام کو ایک قدم بھی راہِ حق پر نہیں اٹھ سکتا:

ایسی بات کی ڈینگ نہ مارو جو تم کرتے نہیں یا کر سکتے نہیں۔ (۶۱/۲)

کسی بے گناہ کو ذہنی یا بدنی اذیت نہ دو۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اگر کبھی ایسی لغزش ہو جائے تو آئندہ کے لیے توبہ کرو۔ (۸۵/۱۰)

حسد اور وسوسوں سے بچو (۱۱۳/۵)۔ (۱۱۴/۴-۵) وسوسے زندگی دوبھر کر دیتے ہیں اور حسد تو فساد کی جڑ ہے۔

جس طرح قوم کا نظریۂ حیات اپنی منفرد خصوصیات کا حامل ہے، اسی طرح مرد خدا کا کردار ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں نے دین کے حسن و نکھار سے منہ پھیر کر اپنا تشخص مٹا دیا اور بے مائیگی اور ذلت و خواری کی زندگی قبول کر لی اور غیروں کی تقلید میں خود کو "ترقی پسند" سمجھ کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ انتہائی بدنصیبی ہے۔ اور اگر ـ

کی مسلم نے ترقی جو فرنگی بن کر
یہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

عائلی زندگی

معاشرتی زندگی میں "گھر" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ نسلِ انسانی کے لیے پہلی درس گاہ ہے جہاں سے اولادِ آدم تعلیم و تربیت لے کر زندگی کے میدان میں داخل ہوتی ہے۔ اولاد جس قسم کا سبق لے کر گھر سے نکلے گی اسی طرح کا معاشرہ تعمیر ہو گا۔

معاشرہ اس کے سوا کیا ہے کہ افراد منقسم ہو کر اپنے اپنے گھروں میں بستے ہیں۔ صبحدم وہ نکل جاتے ہیں۔ ان کے بچے بھی فضا میں پھیل جاتے ہیں، اور رات کو واپس گھروں میں سمٹ آتے ہیں۔ صالح اور پُرسکون گھروں سے نکلے تو فضا بھی صالح و پُرسکون۔ آلودہ و پُرفساد گھروں سے نکلے تو فضا بھی آلودہ و پُرفساد!

شیر غاروں میں جنم لیتے ہیں۔ پرورش اور تربیت پا کر شیر بن کر نکلتے ہیں اور دہاڑ کر جنگل میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیتے ہیں۔ گیدڑ بلوں میں جنم لیتے ہیں۔ پرورش اور تربیت پا کر زمین میں چھپ جاتے ہیں اور اپنی مکروہ آواز پر اکٹھے ہو کر فصلوں کو برباد کر دیتے ہیں۔ انسان چاہے تو زمین پر شیروں کو پیدا کر دے چاہے تو اسے گیدڑوں سے بھر دے!

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ انسان بننے سے پہلے مکمل حیوان ہونا ضروری ہے۔ چند حقائق خود سن لیں۔ حیوان اپنے گھروں میں پُرسکون زندگی بسر کرتے ہیں۔ میاں بیوی آپس میں پیار و محبت سے رہتے ہیں۔ نہ لڑتے ہیں نہ جھگڑتے ہیں نہ کوئی طلاق کا تنازعہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے پر شکوک و شبہات نہیں ہوتے۔ رشتوں سے بے وفائی نہیں ہوتی۔ خاندانی جھگڑے نہیں ہوتے۔ جو ق

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس جوڑے ہیں کہ فطرت نے لگا دیئے ہیں اور "وحی" کے پابند کر دیئے گئے ہیں۔ آزاد اور خود مختار انسان کو "پابندیٔ وحی" کے نتائج دیکھ کر حیوانوں سے سبق لینا چاہیئے۔

سب سے پہلے مرد اور عورت کی حیثیت کو از روئے وحی واضح کر دینا ضروری ہے۔ یہ مسئلہ غالباً ازدواجی زندگی کی ابتدا ہی سے متنازعہ فیہ چلا آ رہا ہے۔ بعض اوقات بحث مباحثہ کے لیئے بڑا دلچسپ موضوع بنتا ہے۔ کبھی باعثِ تکرار ہوتا ہے لیکن اکثر اوقات وجہ فساد ثابت ہوتا ہے۔ اور اس تنازعہ کے تمام مظاہر صرف اس لیئے رونما ہوتے ہیں کیونکہ وحی کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

دیگر مخلوق کی طرح حیات آدم کا آغاز بھی نفس واحدہ سے ہوا اور اسی میں سے اس کا جوڑا پیدا ہوا۔ (۴/۱) فطرت نے آدم کو دو حصوں میں منقسم کر دیا اور دونوں تو شش [illegible] سکون وحدت میں ایک دوسرے کے لیئے سرگرداں رہتے ہیں"

گردانِ حیات [illegible] کہ اگر ایک کو دو میں تقسیم کر دیا جائے تو ایک کی وحدت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ فرائض منصبی کے لحاظ سے اگر جسم کے ایک حصے کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہو تو جسم کی وحدت پھر بھی قائم رہتی ہے اور حقوق برابر رہتے ہیں۔ (۲/۲۲۸-۲۳۲)

بے شک مرد کو عورت پر فضیلت درجہ کو قرار دیا گیا ہے (۴/۳۴) لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مرد کے ذہن میں احساس برتری پیدا ہو اور عورت احساس کمتری میں مبتلا رہے۔ وحدت آدم کو سمجھ لینے سے اس کا صحیح مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فساد زندگی کا بنیادی سبب "وحدت" کو نہ سمجھنے

ہے۔ اگر مرد اور عورت دونوں عارفِ حق ہوں تو گھرانہ نمونۂ جنت ہے اور اگر ان میں سے ایک بھی غیر عارفِ حق ہو تو نمونۂ جہنم ہے۔

بعض اوقات گھر میں فساد اُبھرنے کا سبب یہ ہوتا ہے کہ مرد عورت پر برتری جتانا چاہتا ہے اور عورت چاہتی ہے کہ مرد اس کا غلام بن کر رہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دونوں نے حقیقتِ وحدت کو نہیں سمجھا۔

گھر کے سکون کو لوٹنے والوں میں مرد یا عورت کے رشتہ دار بھی شامل ہیں۔ اور یہ بھی ایک غیر قرآنی معاشرے میں ہی ممکن ہے جس میں شریکِ زندگی ایک دوسرے سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ لوگوں کا کردار معیاری نہیں ہوتا۔

گھر میں فساد اور بے سکونی پھیلنے کا سبب زیادہ تر غلط معاشی (یا اقتصادی) ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ایک ایسے معاشرے ہی میں ممکن ہے جہاں قرآن کا معاشی نظام رائج نہ ہو۔

دراصل قرآنی اور غیر قرآنی معاشرے کی کیفیت بنیادی طور پر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ اور اسی طرح قرآنی اور غیر قرآنی افراد آپس میں متضاد ہوتے ہیں۔ دونوں معاشروں میں زندگی کا کوئی گوشہ ایک جیسا نہیں رہ سکتا۔ قرآنی معاشرے کی عائلی زندگی غیر قرآنی معاشرے کی عائلی زندگی سے یقیناً مختلف ہوگی۔ قرآنی اور غیر قرآنی کردار کے حامل جوڑوں کی زندگی بھی ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔

انسانیت کی تعمیر اور سیرت و کردار کی تعمیر میں جذبات کا عمل دخل اتنا تو زیادہ اور اہم ہے جتنا کہ معاشیات کا بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اگر دو بنیادی جذبات شہوت اور رزق کو جو بنیادی ہیں منظم اور ضبط میں رکھ کر حقیقت عدل کے ساتھ استعمال میں لایا جائے تو ایک مثالی معاشرہ قائم ہو جاتا ہے۔ قرآن نے انفاقِ رزق کے متعلق بار بار

تاکیداً ہدایت اور حکم دیا ہے۔ اور شہوت (جنسی) کے بارے میں متعدد بار فحاشی سے اجتناب اور شرمگاہوں کی حفاظت کا حکم دیا ہے اور اس کے علاوہ بیشتر اشارات قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ کی نظروں میں آئیں گے۔ دو آیتیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔

ازدواجی زندگی کا مقصد عفت قائم کرنا ہے نہ کہ شہوت رانی۔ (۲۴/۴) عورت مرد کے لیے کھیتی کی مثل ہے وہ جس طرح چاہے اپنی عورت کے پاس جائے لیکن مستقبل کا خیال رکھے۔ (۲/۲۲۳) شہوت رانی کے مرتکب ہونے والوں کے لیے قرآن نے "مسافحین" کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی ہیں "مادہ تولید کو یونہی بہا دینے والے" ——— (ان اشارات میں خاندانی منصوبہ بندی کے مسئلہ کا حل بھی موجود ہے۔ افسوس کہ اس کے واسطے نہایت مکروہ اور ضرر رساں طریقے استعمال کیے جاتے ہیں جن کے بدولت نئی نسل سے کوئی شخص [illegible] کر سکتا حالانکہ شرفِ انسانیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اعلیٰ اخلاقی اقدار زندگی [illegible] کی جائیں اور سیرت و کردار میں بلندی پیدا کی جائے) ——— "مادہ تولید کو یونہی بہا دینے" کا اطلاق سنِ بلوغت ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے جنسی پہلو کا تجزیہ کیا جائے اور اس میں انسان کی بے راہروی کے بے شمار اور ناقابلِ تلافی نقصان دہ نتائج کا جائزہ لیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جنسیات کے متعلق وحی کی ہدایت کس قدر پُر از حکمت اور انسان کے لیے نفع رساں ہیں۔ قرآن کی یہ ہدایت در حقیقت اصل مقصد انسانیت کو پستی سے اٹھا کر بلندیوں کی طرف لے جانا ہے۔ آدم کو اس کی حقیقت کی طرف لوٹانا ہے۔ ورنہ اللہ کی ذات ہر شے سے بے نیاز ہے۔

(عورت فطرتاً مرد پر جسمانی سختی تو نہیں کر سکتی لیکن سمجھنے اور رفاقت و ہمبستری کا حربہ استعمال کر سکتی ہے) درحقیقت فساد سے بچنے کا احسن طریقہ متقیوں کیلئے مصالحت ہی ہے۔ (۴/۱۲۸)۔ (فریقین کی باہمی رضامندی سے ہو یا دوسروں کی مداخلت سے)۔

اگر کبھی یہ اتفاق ہو کہ عورت سے شاکی ہو کر مرد غصے میں آ جائے اور اپنی عورت کو ماں کہہ دے (جس سے رشتۂ ازدواجیت منقطع کرنے کا اظہار ہو) در بعد میں پشیمان ہو تو وہ اپنی عورت کے پاس جانے سے پہلے ایک غلام آزاد کرے گا جو نہ رکھتا ہو تو متواتر دو ماہ روزے رکھے گا۔ اس کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلائے گا۔ (۵۸/۲-۴)۔ (اگرچہ زبان سے بیوی کو ماں کہہ دینے سے وہ زوجہ کی ماں تو نہیں بن جاتی لیکن غصے میں بے قابو ہو جانا تو ایک عبد مومن کا شیوہ نہیں ہے۔ وہ پھر اس قسم کا گھٹیا فیصلہ بک دینا اسے کیونکر زیب دے کر دے تو سبق آموزی کے لئے کفارہ ادا کرنے کا حکم خالی از حکمت نہیں ہے)

اگر کبھی مرد و عورت میں کسی سبب کشیدگی یہاں تک بڑھ جائے کہ مرد اپنی عورت کے پاس نہ جانے کی قسم اٹھائے تو اس کے لئے چار ماہ کی مہلت ہے جس مدت کے اندر مرد کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا وہ عورت کو زوجیت میں رکھنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ اس مدت کے اندر قسم توڑ کر عورت کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ کرے تو اسے قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ یہ کہ دس محتاجوں کو کھانا کھلائے یا دس ضرورتمندوں کو کپڑے پہنائے یا تین روزے رکھے (۵/۸۹)۔ (۲/۲۲۶) اور اگر اس مدت میں مرد اپنی قسم پر قائم رہتا ہے تو پھر اسے چاہئیے کہ وہ طلاق کا راستہ اختیار کرے (۲/۲۲۷)۔

طلاق کا نفاذ عورت کے ایام حیض کے بعد ہوگا کہ عدت کی شمار پورا ہو سکے

عدت کا عرصہ تین حیض تک ہے۔ اگر عورت حاملہ ہے تو اسے ظاہر کرے۔ اس مدت میں مرد اپنی عورت کو واپس زوجیت میں لے آنے کا حق رکھتا ہے بشرطیکہ دونوں سلوک کے ساتھ زندگی بسر کرنا گوارا کریں۔ (۶۵/۱)۔

ایام مدت میں مرد کو چاہیئے کہ خوف خدا رکھتے ہوئے عورت کو گھر سے نہ نکالے نہ عورت کو چاہیئے کہ وہ گھر سے نکلنے کی کوشش کرے۔ اگر عورت بے حیائی کی مرتکب ہو تو مرد اسے گھر سے نکال دینے کا حق رکھتا ہے (۶۵/۱)۔

دو ماہ ارادۂ طلاق میں گزر جانے کے بعد تیسرے ماہ میں یا تو مرد شائستہ طریقے سے عورت کو زوجیت میں لے آئے گا یا علیحدگی اختیار کرے گا۔ دوسری صورت میں مرد کو یہ زیب نہیں دیتا کہ جو کچھ اس نے اپنی عورت کو دے رکھا ہے اسے واپس لے۔ البتہ باہمی رضامندی سے حدود اللہ کو قائم رکھتے ہوئے عورت رہائی پانے کے بدلے میں جو ادا کر دے وہ جائز ہے۔ (۲/۲۲۹)۔

ارادۂ طلاق میں تین ماہ گزر جانے کے بعد مرد اپنی عورت کو زوجیت میں نہیں رکھ سکتا۔ بجز اس کے کہ مطلقہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کے بعد طلاق حاصل کر چکی ہو (یا بیوہ ہو چکی ہو) ایسی صورت میں گر دونوں باہمی رضامندی سے دوبارہ زوجیت اختیار کرنا چاہیں تو حدود اللہ کو قائم رکھتے ہوئے اس کی اجازت ہے (۲/۲۳۰)۔

دوران مدت مرد کو طلاق کا ارادہ ترک کر کے رشتہ استوار کرنے کا فیصلہ اس نیت سے ہرگز نہ کرنا چاہیئے کہ وہ عورت سے انتقام لے۔ اللہ کے احکام مذاق نہیں ہیں۔ (۲/۲۳۱)۔

طلاق ہو جانے کے بعد عورت گر کسی دوسری جگہ نکاح کی کوشش کرے

تو مرد اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہ کرے۔ یہ نہایت ناپسندیدہ حرکت ہے (۲/۲۳۲)۔

عدت کے دوران میں مرد کسی دوسری جگہ نکاح کرنے کا ارادہ ظاہر کر سکتا ہے یا شریفانہ طریقے سے بات چیت کر سکتا ہے لیکن پختہ ارادہ یا قول و قرار نہیں کر سکتا نہ پوشیدہ طور پر کسی سے وعدہ کر سکتا ہے (۲/۲۳۵)۔

عدت کے دوران میں عورت کی رہائش اور خورد و نوش کی ذمہ داری معمول کے مطابق مرد پر عائد ہوتی ہے۔ (۲/۲۴۱)۔

جس عورت کو ہاتھ لگائے بغیر طلاق مل جائے اس کے لئے کوئی عدت نہیں (۳۳/۴۹)۔

جو عورت حیض سے ناامید ہو چکی ہو اور حالت سن یاس مرد پر مشتبہ ہو یا جس عورت کو حیض آیا ہی نہ ہو اس کے لیے عدت تین ماہ ہے۔ (۶۵/۴)۔

حاملہ عورت کی عدت وضع حمل تک ہے۔ اس مدت میں ہر قسم کا معمولی خرچ مرد برداشت کرے گا۔ عورت کو اپنے گھر میں رکھے گا۔ اسے کسی قسم کی تنگی نہ ہونے دے گا۔ پیدائش کے بعد ماں بچے کو دودھ مرد کی رضامندی سے پلائے گی جس کی اجرت مرد کو ادا کرنی ہوگی۔ اگر بچے کو دودھ پلانے میں مرد اور عورت کے درمیان اختلاف ہو تو کسی دوسری عورت کا (یا کوئی اور) دودھ پلانے کا بندوبست کیا جا سکتا ہے جس کا خرچ حسبِ استطاعت مرد برداشت کرے گا۔ (۶۵/۵-۷)۔

ماں کے لیے دودھ پلانے کا عرصہ دو برس ہے۔ اس عرصہ میں عورت کے کھانے پینے اور لباس (وغیرہ) کی ذمہ داری حسبِ دستور مرد پر

ہیں اور آخرت میں آگ کے پیٹ میں جائیں گے۔ یتیموں کا مال صرف ان کی ذات پر خرچ ہوگا حتیٰ کہ وہ بالغ ہوجائیں اور پھر گواہوں کی موجودگی میں ان کے سپرد کر دیا جائے گا۔ (۴ / ۲ - ۱۰) [اسلامی حکومت موجود ہو تو یتیموں کی سرپرستی وہ خود کرے گی]۔

وراثت

غیر قرآنی معاشرہ کی معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کے لیے وحی نے انفاقِ رزق کا حکم بار بار دیا ہے تاکہ رزق گردش میں رہے اور ایسا نہ ہو کہ لوگ دو طبقوں، امیر و غریب، میں تقسیم ہوجائیں، جن میں ایک طبقہ عیش اڑائے اور دوسرا ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم رہے۔ معاشی لحاظ سے اصلاحِ معاشرہ کے لیے تدریجی طریقہ جو قرآن نے اختیار کیا ہے اس میں وراثت کے مال کی تقسیم کا اصول (یا قانون) بھی شامل ہے۔

ہر وہ شخص جو کسی قسم کا مال رکھتا ہو اس پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اس کی تقسیم کے لیے اپنے والدین اور رشتہ داروں کے بارے میں وصیت چھوڑ جائے (۲ / ۱۸۰) جس پر اپنوں میں سے معتبر گواہ بنائے۔ اگر اتفاق سے حالتِ سفر میں کسی کی موت کا وقت آجائے اور اپنوں میں سے کوئی موجود نہ ہو تو دیگر دو اشخاص کو گواہ بنا لیا جائے جو اللہ کو شاہد ٹھہرا کر سچی شہادت پر قائم رہنے کا حلف اٹھائیں۔ اگر بوقتِ ضرورت یہ گواہ جھوٹی شہادت دیں تو جن کی حق تلفی ہو رہی ہو ان میں دو گواہ بن کر حقائق بیان کریں۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جھوٹی شہادت دینے والے حلف اٹھانے کے بعد رسوائی کا احساس کریں اور حقائق کا انکشاف اپنے لیے باعثِ رسوائی دیکھ کر سچ بولنے پر آمادہ ہو جائیں۔ (۵ / ۱۰۶ - ۱۰۸)

وصیت کو قرآن نے بڑی اہمیت دی ہے کیونکہ انسان کو اپنی زندگی میں مختلف واقعات اور حالات پیش آتے رہتے ہیں، رشتہ داروں میں سے کوئی بدکردار

اور سرکشی ثابت ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے زیادہ ضرورت مند ہے۔ متوفی قرضدار
ہے یا وہ کسی اچھے کام کے لیئے خرچ کرنا چاہتا ہے یا کسی کی مدد کرنا چاہتا ہے یا
اس نے کسی کا نقصان کیا ہے جسے وہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ متروکہ کی تقسیم وصیت
پر عملدرآمد ہونے کے بعد کی جائے گی۔ (۴/۱۱-۱۲)۔

ترکہ کی تقسیم اس طرح ہوگی:

متوفی صاحب اولاد ہے تو ترکہ میں ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے
برابر ہوگا۔ اگر صرف لڑکیاں ہیں، دو یا دو سے زائد، تو ان کا حصہ دو تہائی ہوگا۔
اگر لڑکی ایک ہے تو ترکے کا نصف۔ والدین میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہوگا
بشرطیکہ اولاد ہو۔ اگر اولاد نہ ہو تو ماں کا حصہ ایک تہائی اور اگر بھائی بھی ہوں
تو ماں کا چھٹا حصہ ہوگا۔ جو مال عورتیں چھوڑ مریں ان کی اولاد نہ ہو تو ترکے کا نصف
مرد کا حصہ ہوگا۔ اگر اولاد ہو تو چوتھائی حصہ۔ متوفی بے اولاد مرد ہو تو عورت یا عورتوں
کا چوتھائی حصہ۔ اگر اولاد ہو تو آٹھواں حصہ ہوگا۔ اگر میراث ایسے مرد یا ایسی عورت
کی ہو جس کا باپ زندہ نہ ہو اور بیٹا بھی کوئی نہ ہو لیکن ایک بھائی اور ایک بہن ہو
تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہوگا۔ اگر ایک سے زیادہ ہوں تو سب ایک
تہائی میں شریک ہوں گے (۴/۱۱-۱۲) اگر متوفی مرد بے اولاد ہو اور اس کی بہن ہو
تو اس کا حصہ ترکے کا نصف ہوگا۔ اگر متوفی عورت بے اولاد ہو اور اس
کا بھائی ہو تو وہ تمام ترکے کا وارث ہوگا۔ اگر بہنیں دو ہوں تو دونوں کا حصہ
دو تہائی ہوگا۔ اگر بہن بھائی مخلوط ہوں تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔
(۴/۱۷۶)۔

میراث کی تقسیم کے وقت متوفی کے رشتہ دار، یتیم اور ضرورت مند جو
موجود ہوں تو ان کو ترکے میں سے کچھ دے دینا بڑی نیکی [illegible]

کچھ بھی کسی کو دیا جائے خندہ پیشانی سے دیا جائے! (۲/۸)

قانونِ وراثت کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ لوگ ضرور مال جمع کر کے رکھیں تاکہ اس پر عمل جاری رہے ورنہ یہ قانون ہی منسوخ ہو جائے گا۔ بلکہ اس کے برعکس رزق کو ایک جگہ جمع نہ ہونے دینا گردش میں رکھنا مقصود ہے۔ آیاتِ وحی اگر پیکرِ انسانی میں حرکت پذیر ہوں تو عملاً محفوظ ہیں۔ مگر فقط تحریر و حفظ میں محفوظ ہیں تو عملاً قرآن منسوخ ہے!

قرض کے لین دین کی ضرورت موجود رہتی ہے جب تک کہ قرآنی معاشرہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ وحی نے اس کے متعلق ہدایت دی ہے کہ قرض کے لین دین کے معاملہ کو تحریر میں لایا جائے جس میں قرض کی میعاد متعین ہو۔ لکھنے والا انصاف کو ملحوظ رکھے تاکہ فریقین میں سے کسی کا نقصان نہ ہو۔ تحریر کا مضمون قرض لینے والا لکھوائے گا اور خوفِ خدا رکھتے ہوئے اس میں کوئی ہیر پھیر نہیں کرے گا۔ اگر قرض لینے والا ضعیف ہے یا کم عقل ہے یا لکھوانے کی اہلیت نہیں رکھتا تو اس کا کوئی ولی تحریر کروائے گا۔ معاہدہ پر دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہوں۔ دو عورتیں اس لیے کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلائے۔ وقتِ ضرورت گواہ طلب کیے جائیں تو انکار نہ کریں۔ قرض تھوڑا ہو یا زیادہ معاہدہ تحریر میں لانا ضروری ہے۔ شکوک شبہات اور تنازعات سے بچنے کا یہی آسان طریقہ ہے۔ دست بدست خرید و فروخت یا لین دین کو تحریر میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کاتب پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنا یا اسے ضرر پہنچانا جرم ہے۔ حالتِ سفر میں قرض لینے کی ضرورت پڑ جائے اور معاہدہ کو تحریر میں لانے کا بندوبست نہ ہو سکے تو کوئی چیز رہن رکھ کر قرض لیا جا سکتا ہے۔ اگر قرض دینے والا اس کی ضرورت نہ سمجھے اور بطور امانت قرض دے دے تو لینے والے کو امانت کا پاس رکھنا چاہیئے

قرض لینے والا تنگدست ہے تو دینے والے کو اسے مہلت دینی چاہیئے اور اگر ایسے مقروض کو قرض بخش دیا جائے تو یہ بڑا کارِ خیر ہے (۲/۲۸۰-۲۸۳)۔

سُود کا تعلق قرض سے ہے (ربٰوا کے معنی وسیع تر ہیں جس میں سُود بھی شامل ہے)۔

(انفاقِ رزق، رزق کو گردش میں رکھنے (یعنی جمع کر کے نہ رکھنے) کی تاکید قرآن میں بار بار نظروں سے گزرتی ہے۔ جس معاشرے میں اس حکم کی تعمیل جاری ہو وہاں انفرادی طور پر ایک دوسرے سے قرض لینے دینے کے امکانات مفقود ہو جاتے ہیں۔ قوم کی فاضل دولت بالآخر حکومت کے خزانے (بیت المال) میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ اور اگر معاشرے کا کوئی فردِ معذور یا محروم یا ضرورتمند ہے تو اس کی مدد کرنا حکومت کا فرض ہوتا ہے۔ نہ جانے یہ معاشرہ مسلمانوں کو کب نصیب ہوگا۔ کسی (نام نہاد) اسلامی حکومت کو بھی ہرگز اپنے خزانے سے ضرورتمندوں کو باسُود قرض دے کر اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جنگ کا اعلان نہ کرنا چاہیئے۔ (۲/۲۷۹)۔

حلال اور حرام

کے مسئلہ کو خورد و نوش اور استعمال میں آنے والی چیزوں تک محدود کیا جائے تو اس کے بارے احکامِ قرآن بالکل واضح ہیں۔ ارشاد ہے ـــــ مرا ہوا جانور، بہتا خون، سؤر کا گوشت۔ جو جانور اللہ کے نام کے سوا ذبح کیا گیا ہو، جو جانور گلا گھٹ کر مر جائے۔ یا گر کر یا چوٹ لگنے سے مر جائے۔ یا سینگ لگ جانے سے مر جائے یا جسے درندے پھاڑ ڈالیں۔ یا جن کی استھانوں پر چڑھاوے کے طور پر قربانی دی جائے سب حرام ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی وقت ناچار اور مجبور ہو تو ان میں سے اتنا چکھ سکتا ہے جتنا کہ اشد ضروری ہو اور اس کے دل میں حکمِ الٰہی کی نافرمانی

کو خیال تک نہ گزرے۔ اور ان کے علاوہ کسی چیز کو حرام یا حلال ٹھہرانا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ یونہی جو جھوٹ زبان پر آجائے کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرا دینا اللہ پر بہتان باندھنا ہے اور شر انگیز افتراء ہے۔ جن چیزوں کو اللہ نے حلال ٹھہرایا ہے انھیں کوئی حرام نہیں کر سکتا۔ ایسا کرنا حدود اللہ سے تجاوز کرنا ہے کسی حلال شے کو حرام ٹھہرانا اور حرام کو حلال ٹھہرانا پیغمبر کے اختیار میں بھی نہیں ہے۔ (٢/١٧٣، ٥/٣، ٦/١٤٦، ١٦/١١٦، ٥/٨٧، ١٠/٥٩، ٦٦/١)۔

آبی شکار حلال ہے (٥/٩٦) سدھائے ہوئے شکاری جانور جو شکار کریں وہ حلال ہے بشرطیکہ ان پر اللہ کا نام لے کر ذبح کر لیا جائے (٥/٤)۔ چوپائے حلال ہیں بجز اُن کے جو بتا دیئے گئے ہیں (٢٢/٣٠) اہلِ کتاب کا کھانا مسلمان پر حلال ہے (٥/٥)۔ کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں ہوں یا زیب و زینت کی اشیاء سب اللہ نے اپنے بندوں کے لیئے پیدا کی ہیں انھیں کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا۔ نعمتیں دنیا میں بھی ایمان والوں کے لیئے ہیں اور آخرت میں بھی انھی کا حصہ ہوں گی۔ (٧/٣٢)۔

نسبت کی بلند اقدار کے پیشِ نظر دنیوی لذتوں کے دلدادہ ہوئے لوگوں سے اللہ مخاطب ہے ——— لوگو یہ کیا ادنیٰ سی باتوں میں اُلجھ کر رہ گئے ہو۔ غور سے سنو کہ تم پر کیا کچھ حرام ہے۔ شرک کرنا حرام ہے۔ والدین سے بدسلوکی کرنا حرام ہے۔ ناداری کے خوف سے قتلِ اولاد حرام ہے۔ پوشیدہ یا ظاہر بے حیائی حرام ہے۔ کسی پر ناحق زیادتی کرنا حرام ہے۔ ناحق قتل حرام ہے۔ بلا علم اللہ کی طرف باتیں منسوب کرنا حرام ہے۔ یتیموں کا مال کھانا حرام ہے۔ ماپ تول میں کمی کرنا حرام ہے۔ بے انصافی کرنا حرام ہے۔ عہد باندھ کر توڑ دینا حرام ہے۔ سود لینا حرام ہے اور راہِ حق کو چھوڑ کر باطل کا راستہ

اختیار کرنا حرام ہے۔ یہ ہیں اصل حرام جن کو تم نے پسِ پشت ڈال رکھا ہے (۶/۱۵۲-۱۵۳، ۷/۳۲-۳۳، ۲/۲۷۵)۔

معیشت

معاشرتی زندگی میں معیشت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ایک طرف انسان کی ضروریات اور مادی ارتقاء کا دارومدار اسی پر ہے دوسری طرف انسان کی ذات (خودی) پر اثرانداز ہوکر روحانی ارتقاء کا ایک بنیادی سبب ہے۔ (عنوان "زکوٰۃ" دیکھئے)۔

معاشی زندگی کے متعلق وحی نے دو بنیادی اصول وضع کیے ہیں جن کی پابندی کی جائے تو تمام اقتصادی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں اور انسانیت بلندیوں کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہے۔ ارشاد ہے — انسان کے لیئے معاوضہ اسی قدر ہے جتنی وہ محنت کرے گا (۵۳/۳۹) اور اس معاوضہ میں سے اپنی ضروریات پوری کرکے بقیہ سب اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا (۲/۲۱۹)۔

زراعت ہو یا تجارت، صنعت ہو یا فنی پیشہ یا کوئی دیگر کاروبار، ہر شخص صرف اپنی محنت کے معاوضے کا حقدار ہے۔ معاشرے کا کوئی فرد بے کار بیٹھ کر دوسروں کی محنت کا نہ فائدہ اٹھا سکتا ہے نہ اس پر عیش اڑا سکتا ہے ورنہ کسی کی محنت کا حق غصب کرسکتا ہے۔

قرآن نے ضروریاتِ زندگی کا تعین نہیں کیا بلکہ فرمایا ہے، نعمتیں دنیا و آخرت دونوں میں مومنین ہی کے لیئے ہیں انھیں کون حرام ٹھہرا سکتا ہے (۷/[illegible]، ۷/۳۲) اسی میں انسانی خودی کا ارتقاء اور حصولِ نصب العین کا راز پوشیدہ ہے۔

مذکورہ دو آیتوں کے آخری حصوں پر غور فرمائیں۔ پہلی آیت کے آخری الفاظ ہیں ——— بہترین زیب آرائش بندۂ خدا کے لیئے ارتقاء (پرہیزگاری) ہے اور شکر کرنے والوں کے لیئے اس میں نشانیاں ہیں۔ دوسری آیت کے آخری الفاظ ہیں ——— علم رکھنے والوں کے لیئے آیات مفصل ہیں۔ گویا زیب و زینت اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں بے شک مومنین کے لیئے حلال ہیں لیکن وحی کی تعلیم میں غور و فکر کرنے والے متقین کے لیئے اس میں قرب خداوندی حاصل کرنے کا راز پنہاں ہے۔ اس کو عملی مثال سے سمجھیں۔

ایک عبد مومن محنت و مشقت سے جو معاوضہ حاصل کرتا ہے وہ اس کی "ضروریات" سے کہیں زیادہ ہے۔ اللہ کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے کسی صورت میں دولت جمع کر کے نہیں رکھ سکتا۔ مُہ دتر ہے۔ فحاشی، منشیات، جوا، قرعہ اندازی، چڑھاوے چڑھانے اور دکھاوے کے لیئے خرچ کرنے کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ لامحالہ اس کے لیئے دو ہی راستے باقی رہ جاتے ہیں۔ یا ضروریات سے بچا ہوا رزق محروموں اور ضرورتمندوں کو دے ڈالے یا جائز نعمتوں سے محظوظ ہو ——— رزق حلال سے اپنے ذوق شوق پورے کرنا گناہ نہیں ہے لیکن جس کی نگاہ قلب حق کی متلاشی ہو جو معراج انسانیت کے قدموں پر چل کر قرب الٰہی کی تمنا لیئے پھرتا ہو وہ اپنے تمام ذوق شوق اللہ کی راہ میں قربان کر دے گا ——— یہی وہ راہ مستقیم ہے جس پر چل کر زندگی گذارنے کی قرآن ہدایت دیتا ہے اور اس راہ کا مسافر جس قدر ایثار کرے گا اسی کے مطابق درجات اُخروی حاصل کرے گا۔ بے شک اس راہ کے تمام مسافروں کا مقام درجہ بدرجہ جنت ہی میں ہوگا لیکن آگے بڑھنے والوں کا مقام بلند ترین ہوگا اور ساتھ انہیں قرب الٰہی حاصل ہوگا۔ (۸ ۔ ۱۰۰ ۔ ۱۱) [۵۲]

بعض لوگ دینِ اسلام اور سوشلزم یا کمیونزم میں مماثلت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایک مضحکہ خیز نظریہ ہے جو قرآن کا سرسری مطالعہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر مارکسی نظریۂ اقتصادیات قرآن کے مکمل نظریۂ حیات میں سے زندگی کے صرف اقتصادی پہلو سے۔ اور وہ بھی جزوی طور پر، مماثلت رکھتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام اور کمیونزم ہمنوا ہیں۔

وہ نظریۂ فکر فقط مادی ہے جو جسموں کو جنم دے کر ان سے مشقت لینے کے بعد انسانیت کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ اس کے برعکس نظریۂ وحی انسان کو روح اور مادے کے امتزاج سے جنم دے کر لامتناہی بلندیوں کی طرف رواں دواں رکھتا ہے۔ وہاں دہریت ہے یہاں ابدیت ہے۔ وہاں محض فکرِ معاش ہے یہاں فکرِ معاش سے زیادہ فکرِ معاد ہے۔ وہ عقل فنائی اور یہ جذبۂ وحی فنا فی اللہ کا سبق دیتی ہے۔ وہ آفاق میں گم ہیں یہاں گم ہیں آفاق۔ وہ تسخیرِ فطرت میں منتشر اور تباہ کن مقاصد لئے ہوئے ہیں قرآن تسخیرِ فطرت کی دعوت تعمیری مقاصد کے لئے دیتا ہے۔ وہاں مجاز ہے یہاں حقیقت ہے۔ وہاں فقط جسم ہے یہاں جسم میں روح بھی ہے۔ وہ عقل ہے یہ عشق ہے۔ دونوں میں کوئی بات نہیں ہے۔

وحی کے احکام کی تعمیل جبر و تشدد سے نہیں کرائی جاتی۔ بلکہ اس کی تعلیم سے ذہن و قلب روشن کیے جاتے ہیں تاکہ انسان میں جوہری توانائی پیدا ہو جسے محسوس کر کے وہ اپنی حقیقت کو پہچانے اور رضاکارانہ طور پر وحی کی پیروی کرے۔ جبر و تشدد کا طریقہ حیوانوں سے کام لینے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے اور انہیں "روٹی" دے کر زندہ و توانا رکھا جاتا ہے۔ اور عجب یہ ہے کہ دعویٰ ارتقائے آدم کا کیا جاتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ قرآنی معاشرے کی مثالی صورت موجود نہیں

ہے جس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی دوڑ دولت واقتدار
حاصل کرنے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ اصلاحی اور ارتقائی کاموں میں ایک دوسرے
پر سبقت لے جانے کے لئے ہوتی ہے اور مدنظر خوشنودیٔ خالق ہوتی ہے
تاکہ سلسلۂ حیات میں بلند مقامات حاصل ہوں (۱۰۳/۲ ، ۵۷/۲۱) عزت واحترام
کا معیار نسل و رنگ نہیں ہوتا بلکہ صفات اور سیرت و کردار ہوتا ہے (۴۹/۱۳ ،
۲۶/۱۳ ، ۲۴/۴) زندگی کا نصب العین اپنی ذات میں اس خالق و مالک اور رب العزت
رحیم و کریم ، جبار و قہار ، قادر مطلق ، احد و صمد کی صفات (بقدر بشریت) پیدا
کرنا ہے (۲/۱۳۸) ان اصولوں کی بنا پر قرآن کا مثالی معاشرہ موجود ہو تو
اس کے مقابلے میں کسی اور نظریہ پر قائم کیا گیا معاشرہ کوئی وقعت نہیں
رکھتا۔

وہ دین یا نظریۂ زندگی ہی کیا ہے جو انسان کے بنیادی حقوق اور
شخصی آزادی بھی چھین لے۔ انسان ذوق چھین جانے تو انسان تقویٰ کے پاس
حسن کمال کے قریب تر ہونے کا اور کونسا ذریعہ باقی رہ جاتا ہے؟ مقید ہجوم
کی محنت کا نتیجہ مادی ارتقاء تو ہو سکتا ہے لیکن یہ انسان کو مہذب حیوانی سطح پر
رکھنے اور انسانیت کا گلا گھونٹ دینا ہے۔

امت میں فقدان غیرت کے سبب آج زمین پر کفر و مشرکین مسلط ہیں اور
دیگر پسماندہ قوموں کے ساتھ مسلمان قوم بھی ان کی مقلد اور دست نگر بن کر رہ گئی
ہے۔ قابل فکر بات یہ ہے کہ ان قوموں کا دولتمند اور خوشحال طبقہ مشرکین کا مقلد ہے
اور غریب و نادار طبقہ کفار کا مقلد ہے۔ اور آئے دن ان میں طبقاتی منافرت
و کشمکش بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن خصوصیت دونوں طبقوں میں مفقود ہے۔
مشرکین کی تقلید صرف حرص و ہوا کی بنا پر کی جاتی ہے اور کفار کی تقلید

محض جذبۂ انتقام کی بنا پر کی جا رہی ہے۔ اس طبقاتی منافرت اور کشمکش کا انجام بربادیٔ انسانیت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ افسوس تو یہ ہے کہ رہبرِ انسانیت سے اس کی اپنی اُمت بے وفائی کر رہی ہے۔ ورنہ زمین پر نظریۂ وحی غالب ہوتا اور کسی دوسرے نظریے کو پنپنے کا موقع ملتا نہ انسانیت کے لیے ایسے تباہ کن حالات پیدا ہوتے۔

زہے قسمت کہ اُمتِ بے لگام کے قدم یہیں رک جائیں۔ نظر میں قوتِ حق بینی پیدا ہو جائے دل میں احساسِ خودی موجزن ہو اور وہ اپنا رخ وحیٔ نبوت کی طرف پھیر دے۔

اے ایمان لانے والو! اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرض کی مکمل طور پر پابندی کرو اور مرتے دم تک مسلمان مرو۔ تفریق و انتشار کو ختم کر کے متحد ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو (٣ / ١٠٢ - ١٠٣)۔ تم اقبال مندی سے محروم ہو کر صرف اس لیے بے عزت و رسوا ہو کہ فرقوں میں منقسم ہو گئے اور اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت سے منہ پھیر لیا۔ (٨ / ٤٦)۔

حکومت

حکومت کے باب کو "قرآنی معاشرہ" کے بعد دانستہ جگہ اس لئے دی گئی ہے کیونکہ غیر قرآنی معاشرے میں جو حکومت قائم ہوگی وہ بھی غیر قرآنی ہوگی۔ جب تک افرادِ معاشرہ اپنے ذہن و قلب میں وحی کی تعلیم کے مطابق انقلاب پیدا نہ کریں نہ معاشرے کی حالت بدل سکتی ہے (۱۳/۱۱) نہ اللہ کی حکومت قائم ہو سکتی ہے (۱۲/۲۴) جس طرح کے افرادِ معاشرہ ہوں گے اسی طرح کی حکومت قائم ہوگی۔ نیک، صالح اور بلند کردار لوگوں کی اکثریت کی نمائندہ حکومت بھی نیک، صالح اور بلند کردار ہوگی۔ بدکردار لوگ جو حکومت منتخب کریں گے وہ بدی کا پیکر ہوگا۔ چوروں، راہزنوں اور ظالموں کا سردار کون ہو سکتا ہے؟

جمہوریت ہو یا آمریت، صدارت ہو یا ملوکیت۔ ہر نظام میں انسان پر انسان حکمرانی کرتا ہے۔ وحی کے نظامِ حکومت میں انسان پر فقط اللہ کی حکمرانی تسلیم کی جاتی ہے۔ اس میں مقتدر ہستی صرف اللہ کی ذات ہوتی ہے۔ کوئی انسان نہ حاکم ہوتا ہے نہ محکوم۔ (۱۲/۴۰)۔ اللہ کی حاکمیت میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوتا (۱۸/۲۶)، حتیٰ کہ وہ ہستی بھی شامل نہیں ہو سکتی جسے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی گئی ہو۔ (۳/۷۹)۔

طرزِ حکومت کے جمہوری ہونے کا اشارہ وحی سے ملتا ہے۔ ارشاد ہے۔ ساری امت کتاب اللہ کی وارث ہے (۳۵/۳۲)۔ اور نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کو چلانے والے تمام امور مشاورت سے طے کرتے ہیں (۴۲/۳۸) ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت

کو قائم کرنے اور چلانے میں اُمت کے ہر فردِ بالغ کو رائے دینے کا حق حاصل ہے اور وہ ذمہ دار بھی ہے۔ موجودہ جمہوری حکومتوں کی فریب کاریوں کے پیشِ نظر اسلامی حکومت کا نام "مشاورتی نظام" بہتر معلوم دیتا ہے۔

دراصل غرض نام سے نہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ آیاتِ الٰہی متحرک رہیں اور نتائجِ حرکت کے صحیح ہونے کا ثبوت فراہم کریں۔ اگر نامِ حکومت کا اسلامی ہو تا ظاہر ہو لیکن آیات کتاب اللہ میں خاموش منتظرِ حرکت رہیں تو یہ بھی فریب کاری ہے۔

ارشاد ہے:

جو لوگ دنیوی منفعت حاصل کرنے کی خاطر قرآن کے مطابق حکم نہیں دیتے (حکومت قائم نہیں کرتے) وہ کافر ہیں۔ جو حکومت وحی کی تعلیم کے خلاف قائم و رواں ہے وہ اسلامی حکومت نہیں ہے (۵/۴۴)۔ (اور جس حکومت میں) کتاب اللہ کے بعض احکام کی پیروی ہوتی ہے اور بعض کی نہیں ہوتی تو گویا یہ دنیا و آخرت (دونوں میں) ذلت اور عذاب کو دعوت دینا ہے۔ (۲/۸۵)۔

دیگر حکومتیں مکر و فریب یا جبر و استبداد سے قائم کی جاتی ہیں اور سیاست سے چلائی جاتی ہیں۔ اللہ کی حکومت علمِ وحی حاصل کر کے اس پر عمل کرنے اور اس علم و عمل کو دوسروں تک پھیلانے سے قائم ہوتی ہے اور حکمت سے چلائی جاتی ہے۔ وہاں آئین انسان خود مرتب کرتا ہے جو بدلتا رہتا ہے۔ یہاں آئین وحی ہوتا ہے جو غیر متبدل ہے۔ انسانی حکومت جسموں پر قائم کی جاتی ہے۔ اللہ کی حکومت کا غلبہ دلوں پر ہوتا ہے۔ وہاں جاہ و حشمت کا رعب دولت و اقتدار سے بٹھایا جاتا ہے۔ یہاں جمال و جلالِ یزدانی اعلیٰ سیرت و کردار میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہاں ہیبت سے دلوں میں نفرت، جذبۂ انتقام، احساسِ کمتری اور بد

اعتمادی پیدا ہوتی ہے یہاں حسنِ سلوک اور عدل سے دلوں میں محبت، عقیدت، عظمت اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے وہاں اطاعت جبری ہے یہاں اطاعت رضاکارانہ طور پر ہوتی ہے قصہ مختصر وہ قاہری ہے یہ دلبری۔

یہاں ایک متنازعہ فیہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش بے جا نہ ہوگی جو مدتِ دراز سے بنیادی طور پر وجہ انتشارِ امت بنا ہوا ہے یہ کہ آیا دین صرف قرآن ہے یا قرآن و سنت۔ جو لوگ دین کو قرآن و سنت کا مجموعہ قرار دیتے ہیں وہ اپنے حق میں جن آیات کا حوالہ دیتے ہیں ان میں سے چند اہم درج ذیل ہیں۔

"اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔ اور اگر تمہارے درمیان کسی بات میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ اللہ اور آخرت پر یقین رکھنے والوں کے لئے یہی بہتر اور احسن طریقہ ہے۔ ($\frac{4}{59}$)۔

(اے رسول) تمہارے رب کی قسم جب تک یہ لوگ اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کرو اس کو فراخی دل سے قبول نہ کریں۔ مومن نہیں ہو سکتے" ($\frac{4}{65}$)۔

کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جب اللہ اور رسول کوئی امر مقرر کر دیں تو وہ اس میں کچھ اپنا بھی اختیار سمجھیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ صریحاً گمراہ ہو گیا ($\frac{33}{36}$)۔ "اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی" یہ الفاظ قرآن میں متعدد بار آئے ہیں۔

ان آیات میں اللہ کی اطاعت کا مطلب واضح ہے یعنی اطاعتِ وحی

جو اپنی اصل صورت میں بحفاظت موجود ہے۔ اُولی الامر کی اطاعت کے معنی ہیں اللہ کی حکومت کو چلانے والے اصحابِ حکومت۔ اور ختمِ نبوت کے بعد نبی کی غیر موجودگی میں اطاعتِ رسول سے مطلب ان روایات یا احادیث کی اطاعت لیا جاتا ہے جو ختم المرسلین کی طرف منسوب ہیں۔

جو لوگ صرف قرآن کو دین قرار دیتے ہیں وہ اپنے حق میں جن آیات کا حوالہ دیتے ہیں ان میں چند اہم درج ذیل ہیں۔

"اللہ کی کتاب کے سوا کسی کی پیروی جائز نہیں ہے" (۷/۳) "کلامِ الٰہی حق و انصاف کی حکمرانی قائم کرنے کے لئے مکمل ہے۔ اس میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں کیا جاسکتا" (۶/۱۱۶) "مقتدرِ حکمِ اعلیٰ فقط اللہ ہے" (۱۲/۴۰) "اللہ کے حکم میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا" (۱۸/۲۶) "حتیٰ کہ وہ ہستی بھی شریک نہیں ہو سکتی جسے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی گئی ہو" (۳/۷۹)۔

(مذکورہ تنازعہ کا پس منظر یا سبب "ختمِ نبوت" کے عنوان میں درج کر دیا گیا ہے)۔ تاہم مسئلہ کی نزاکت مزید وضاحت طلب کرتی ہے۔ غور فرمائیے،

دراصل نزولِ وحی کے آغاز ہی سے لوگ واضح احکامِ الٰہی کے باوجود جذبات سے مغلوب ہو کر آپس میں اختلاف کرتے، جھگڑتے اور فساد کرتے چلے آ رہے ہیں سوائے اُن لوگوں کے جو پختہ اور صحیح ایمان رکھنے والے ہیں (۲/۲۱۳) اور درست ایمان رکھنے والے جذبات کے غلام نہیں ہوا کرتے (۴۵/۲۳)۔ جو لوگ کتاب اللہ کی موجودگی میں دنیا کے حقیر مفاد کی خاطر جذبات کے غلام بن کر وحی کے اصل مفہوم کو زیرِ حجاب کر دیتے ہیں اور اس

درِ تفریق و انتشار پیدا کرتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹوں میں آگ بھرنے والے حق ناآشناس، ناپاک اور گمراہ ہوتے ہیں۔ اور خود کو اللہ کے مقرب ظاہر کرتے ہیں حالانکہ ان کے لیئے دردناک عذاب ہے (۲/۱۷۴-۱۷۶)۔

متنازعہ فیہ مسئلہ کوئی بھی ہو کتنا نازک ہی کیوں نہ ہو اُمت میں تفریق اور انتشار پیدا کرنے کی از روئے وحی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ (۲/۴۹) وحی پر ایمان لانے والے ہی اگر فرقہ بازی کے شکار ہو جائیں (۳/۱۰۳) اور انتشار کے سبب بے طاقت ہو کر غالب نہ رہیں۔ (۸/۴۶) زمین پر اللہ کی حکومت کون قائم کرے گا۔ فساد کیسے مٹے گا۔ انسانیت کے لیئے امن و سلامتی کی ذمہ داری کون اٹھائے گا۔ وحدت انسانیت کس طرح ممکن ہے اور زندگی کا نصب العین کیونکر حاصل ہو گا؟

جن کا الٰہ فقط اللہ ہو اور معراج انسانیت مدِنظر ہو ان کے لیئے یہ مسئلہ کہ آیا دین صرف قرآن ہے یا قرآن و سُنّت سرے سے متنازعہ فیہ نہیں ہے۔ قرآن مکمل دین ہے کامل نظریۂ حیات ہے۔ اللہ خالق وہ تنہا حاکم ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ اللہ کا رسولؐ اپنی ذاتِ گرامی میں مجسم دین ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل کا وحی کی تعلیم کے خلاف ہونے کا تصور ہی گناہِ عظیم ہے۔ جو شخص ایسا کرنے کی جرأت کرتا ہے وہ دشمن دین ہے دشمن خدا ہے دشمن رسولؐ ہے۔

جس معاشرہ کے افراد وحی کے پیروی کرنے والے ہوں وہاں اللہ کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ نہ کسی انسان کی حاکمیت روا رہ جاتی ہے نہ مذہبی پیشوائیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دین غالب آجائے تو مذہب مفقود ہو جاتا ہے اور اللہ کی حکومت کو چلانے والے وحی کی روشنی میں وقت کے تقاضوں کے

مطابق حکمت سے کام لیتے ہیں اور "سنت" سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں جس حکومت کی بنیاد توحید پرستی پر اٹھائی جائے وہاں کسی معاملہ میں اختلافِ رائے تو ہو سکتا ہے لیکن فرقوں یا جماعتوں یا سیاسی پارٹیوں کو کسی صورت برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

حکومت کے فرائض کو قرآن نے چند الفاظ میں ایسی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ انسانی زندگی کا ہر گوشہ ان میں سمٹ کر آگیا ہے۔ ارشاد ہے۔

—— یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ان کو زمین میں دسترس حاصل ہو تو نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ قائم کریں، معروف کام کرنے کا حکم دیں اور برائی کو روک دیں۔ $(\frac{۲۲}{۴۱})$۔

("معروف" کا وسیع تر مفہوم عرفانِ حق ہے)۔ گویا اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کا مکمل نظام قائم کرے جس میں قوم کے ہر فرد کو ایسے مواقع میسر ہوں کہ وہ انسانیت کی بہبود و ارتقاء کے لئے کام کرنے کے قابل بنے تاکہ اسے عرفانِ حق حاصل ہو۔ ظاہر ہے کہ قوم میں علمی صلاحیتیں بلند معیار پیدا کرنے کے واسطے جہاں دنیوی علوم حاصل کرنے کا معیاری بندوبست کیا جائے گا وہاں وحی کی تعلیم سے بھی اسے کو بہرہ ور کیا جائے گا اور اسی کی روشنی میں اسے تربیت دی جائے گی۔ جس قوم کے بچے قرآنی تعلیم و تربیت سے سرشار ہونے کے ساتھ اعلیٰ و جدید ترین دنیوی علوم حاصل کر کے زندگی کے میدان میں داخل ہوں گے، اس قوم کے سامنے کوئی شیطانی قوت سر نہیں اٹھا سکے گی۔

برائیوں کو روکنے کے لئے قرآن نے اپنی حکومت کو حکمت کے ساتھ سختی کرنے کا حکم دیا ہے۔ وحی نے بعض جرائم کی سزائیں متعین کی ہیں اور بعض

کی نہیں گئیں۔ واضح ہے کہ جہاں سزا کا تعین نہیں کیا گیا وہاں حکومت کو سزا تعین کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

کسی بے گناہ مرد یا عورت پر تہمت لگانا سنگین جرم ہے (۳۳/۵۸)۔ عورت پر تہمت لگانے والا اگر اسے صحیح ثابت کرنے کے لیے چار گواہ مہیا نہ کر سکے تو اس کی سزا اسّی دُرّے ہوگی۔ اگر تہمت طراز آئندہ کے لیے تائب ہو جانے کا یقین دلا دے تو حکومت اسے معاف کر سکتی ہے (۲۴/۴-۵)۔

بے گناہ مرد پر تہمت لگانے کی سزا کا تعین قرآن نے نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ اختیار حکومت کو دیا گیا ہے۔

جو شخص اپنی بیوی پر بدکاری کی تہمت لگائے اور اپنے سوا کوئی دیگر شہادت پیش نہ کر سکے تو وہ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے چار بار اللہ کی قسم اٹھائے گا اور پانچویں بار کہے گا کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ عورت اپنی برأت کے لیے چار بار اللہ کی قسم اٹھا کر پانچویں بار کہے کہ اگر اس کا مرد سچا ہے تو اس پر خدا کا غضب نازل ہو تو وہ بے گناہ قرار دی جائے گی (۲۴/۶-۹)۔

مرد پر عورت کا ایسی تہمت لگانے کے بارے میں قرآن نے چونکہ ذکر نہیں کیا اس لیے حکومت اس کا فیصلہ کرنے کی مجاز ہوگی۔

عورت اگر زنا کی مرتکب ہو اور اس پر چار گواہ (مرد) شاہد ہوں تو اس عورت کو گھروں میں مقید کر دیا جائے یہاں تک کہ موت اس کا خاتمہ کر دے یا اللہ اس کے لیے کوئی اور سبیل پیدا کر دے (۴/۱۵)۔ اور اگر دو مرد زنا کے مرتکب ہوں تو ان کو سخت سزا دی جائے۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو ان کو چھوڑ دیا جائے (۴/۱۶)۔ اللہ ان لوگوں کی توبہ قبول فرماتا ہے جو نادانی سے بری حرکت کر بیٹھتے ہیں اور پھر فوراً سنبھل کر تائب ہو جاتے ہیں (۴/۱۷)۔

زنا کے مرتکب ہونے والے مرد اور عورت کی سزا دونوں کے لیئے سو درّے ہے۔ اور یہ سزا انہیں ایک اجتماع کے سامنے دی جائے گی۔ اور اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والوں کو اُن پر ہرگز ترس نہ آنا چاہیئے۔ (۲۴/۲)۔

زنا کی مرتکب لونڈی کی سزا نصف ہوگی۔ (۴/۲۵)۔ (غلام اور لونڈیوں کا ذکر آگے چل کر آئے گا) مرد ہو یا عورت چور کی سزا ہاتھ کاٹ دینا ہے (۵/۳۸)۔

قتل بالارادہ کی سزا موت ہے۔ (۲/۱۷۸)۔

غیر ارادی قتل کے لیئے قصاص مقرر ہے۔ (۴/۹۲)۔

سنگین جرائم کے علاوہ جن اعمال کو وحی نے شیطانی یا حرام قرار دیا ہے یا اُن سے باز رہنے کی ہدایت کی ہے ان سے معاشرے کو پاک کرنا بھی حکومت کے دائرہ تنفیذ سے باہر نہیں ہے۔ مثلاً ایک دوسرے کا مال ناحق کھانا، سود، رشوت، ملاوٹ، جوا، قسمت اندازی، منشیات، امانت میں خیانت کرنا، بدعہدی، اذیت رسانی (ذہنی یا جسمانی) اور حرام خوری وغیرہ۔ اس کے علاوہ عائلی زندگی میں پیدا ہونے والے مسائل، تقسیمِ وراثت اور قرض کے لین دین جیسے معاملات کو طے کرنا بھی حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔

حکومت اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے یہ احتیاط لازمی طور پر کرے گی کہ فرد کی شخصی آزادی یا بنیادی حقوق کسی صورت میں سلب نہ ہوں۔ ورنہ زندگی کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات

پیدا کرنے کا ذریعہ معاہدات ہوتے ہیں جو تجارتی ہو سکتے ہیں۔ صلح کے، مشترکہ دفاع کے اور دیگر باہمی دلچسپی کے امور پر ہو سکتے ہیں۔ طاقتور قومیں معاہدات میں اپنا نفع محفوظ رکھتی ہیں۔ مگر کمزور اور پسماندہ قوموں سے معاہدات [illegible] کرنے پڑتے

ہیں۔ اور اگر طاقتور قوم کمزور قوم سے معاہدہ کر کے توڑ دے تو وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اور ارشادِ الٰہی ہے۔ (اے ایمان لانے والو!) جو لوگ تم سے عہد باندھ کر بلا وجہ توڑ دیں تو ان سے جنگ کرو اور ان کو عہد شکنی کی سزا دے کر سبق سکھا دو (۹/۱۲ - ۱۴)۔ اللہ کے اس حکم کی تعمیل اسی صورت ممکن ہے کہ امتِ مسلمہ کو زمین پر تسلط حاصل ہو ورنہ کسی قِسم کے معاہدات بے معنی ہیں۔

اگر مسلمان طاقتور اور مسلط ہوں تو حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ کسی قوم سے معاہدہ کر کے بلا وجہ نہیں توڑے گی (۵/۱ ، ۲/۱۷۷ ، ۱۷/۳۴ ، ۲۳/۸ ، ۷۰/۳۲)۔ اگر معاہد عہد شکنی میں پہل کرے تو معاہدہ توڑا جا سکتا ہے (۸/۵۶ - ۵۸) اور مذکورہ بالا حکم (۹/۱۲ - ۱۴) پر عمل بھی ہو سکتا ہے۔

اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حفاظت اور حقوق کی نگہداشت بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ انھیں اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا (۲/۲۵۶ ، ۱۸/۲۹ ، ۲۹/۲۱)۔ ان کے خداؤں کو برا نہیں کہا جائے گا ہو سکتا ہے وہ جذبہ انتقام میں اللہ کے بارے میں بدکلامی کریں۔ (۶/۱۰۸) لیکن انھیں دوست یا رازدار نہیں بنایا جائے گا۔ (۳/۲۸ ، ۳/۱۱۸ - ۱۱۹ ، ۶۰/۱ - ۳)۔

کیونکہ مسلمانوں کو زمین پر مسلط بدینِ خدا دیکھنا چاہتی ہے اور یہ مسلمان جہاد سے منہ پھیر کر آوارہ اور ذلیل و خوار ہوتے پھرتے ہیں!

جہاد

درحقیقت تو مسلم کی ساری زندگی "جہاد" ہے۔ اور اسے اپنی ذات سے لے کر بین الاقوامی سطح تک شیطانی قوتوں کے خلاف مسلسل جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہاں جہاد سے مطلب جنگ یا قتال ہے۔

اللہ نے (بوقتِ ضرورت) مسلمانوں پر جہاد کرنا فرض قرار دیا ہے۔ اگر کسی

کو یہ حکم گوارا نہیں ہے تو اسے یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ اس علیم و خبیر کا کوئی حکم خالی از حکمت نہیں ہوتا اور اس میں مخلوق کی بہتری پنہاں ہوتی ہے۔ (۲/۲۱۶، ۲/۲۴۴) فتنہ و فساد قتل سے بدتر ہے۔ (۲/۱۹۱) جنگ اس لئے کی جاتی ہے تاکہ زمین پر سے فساد مٹ جائے اور جنگ ختم ہو جائے۔ (۴۷/۴)۔

مسلمان جنگ کرنے میں کبھی پہل نہیں کریں گے اور جب دشمن کی طرف سے پہل ہو تو اللہ کے مجاہدوں کو چاہیئے کہ اس پر عذاب الٰہی بن کر ٹوٹ پڑیں اور اسے ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیں۔ (۲/۱۹۰–۱۹۳، ۲۲/۱۳–۱۵، ۲۲/۳۹–۴۰، ۹/۲۹)۔

قوم کو عسکری تربیت دے کر ان میں جنگ کرنے کی اعلیٰ صلاحیتیں پیدا کرنا اور جہاد کی ترغیب دینا حکومت کا بڑا اہم فریضہ ہے۔ (۴/۸۴) اور اس کے ساتھ ساز و سامان جنگ میں بھی غالب قوت فراہم کر کے رکھنا حکومت کا فرض ہے۔ (۸/۶۰)۔

اللہ کے مجاہد قدم جما کر بہادری سے لڑتے ہیں۔ نہ ہمت ہارتے ہیں نہ پیٹھ دکھاتے ہیں۔ اگر اتفاق سے کسی محاذ پر دشمن کے مقابلے میں سامان جنگ یا تعداد کم ہے تو اپنی قوت ایمانی سے کبھی مغلوب نہیں ہوتے (۳/۱۲۲–۱۰۰، ۸/۹–۱۰، ۳/۱۴۶)۔

جہاد ایمان کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ (۳/۱۴۲) ایمان و جذبۂ شوق شہادت سلامت ہو تو دنیا کی تمام افواجِ شیاطین مل کر بھی اللہ کے ان سرباز بندوں کو شکست نہیں دے سکتیں۔ (۸/۶۵–۶۶) ایمان، اتحاد اور قوت موجود ہو تو کوئی شیطانی قوت غالب نہیں آسکتی (۳/۱۷۱–۲۰۰، [illegible])

ہیں۔ ختمِ قرآن کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ شبینے کرائے جاتے ہیں۔ سبیلیں لگائی جاتی
ہیں۔ دیگیں چڑھائی جاتی ہیں۔ چندے دیئے جاتے ہیں۔ جنازوں میں شرکت کی
جاتی ہے۔ قبروں پر دستِ دعا اٹھتے رہتے ہیں۔ چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔
قربانیاں دی جاتی ہیں اور بزعمِ خویش مسلمانی کے دعوے کو سچا ثابت کر کے جنت
کی امید میں کیا کچھ نہیں کیا جاتا لیکن وحی اندازِ صمدیت سے ان تمام پر یہ کہہ کر پانی
پھیر دیتی ہے کہ کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلا کر اور مسجدِ محترم آباد کر کے یہ سمجھ
لیا ہے کہ تمہارے یہ اعمال ان بلند مرتبہ لوگوں جیسے ہیں جن کا ایمان اللہ
اور آخرت پر بے لاگ ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں اور جان
و مال قربان کر کے مسکرا دیتے ہیں؟ (۹/۱۹-۲۲)۔

کوئی مظلوم قوم اگر مدد کے لئے پکارے تو مسلم قوم کا فرض ہے کہ ظالموں
سے جنگ کر کے اسے نجات دلائے۔ ورنہ سرکش قوموں کے حوصلے بڑھیں گے۔
اور زمین پر فساد پھیلنے کی راہ کھل جائے گی (۴/۷۵ ، ۲/۲۵۱)۔

کسی اسلامی ریاست پر کوئی سرکش قوم حملہ آور ہو تو ساری امتِ مسلمہ پر
کہ اس سے جنگ کرے گی (۵/۱-۲)۔

جنگ کے دوران یا ختمِ جنگ ہونے میں مال یا میدانِ جنگ کی سبب
پیدا ہو جائے تو یہ جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے ورنہ اس کا نتیجہ شکست کی صورت میں
عین ممکن ہے۔ (۳/۱۵۲ ، ۸/۶۷)۔

جہاد فی سبیل اللہ تو یہ ہے کہ جب مسلمان کافروں سے بھڑ جائیں تو ان کو
تہس نہس کر کے رکھ دیں۔ اور جو زندہ بچ جائیں انہیں مضبوطی سے قید کر لیں
پھر اس کے بعد ان قیدیوں کو یا احسان یا فدیہ لے کر آزاد کر دیں (۴۷/۴)
(یہ حکم "غلامی" اور لونڈیوں کے مسئلہ کو جڑ سے ختم کر دیتا ہے) اور ...

غنیمت جو ہاتھ آئے اُس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسولؐ (بیت المال) کا ہے اور باقی مجاہدین میں مصلحت کے ساتھ تقسیم کر دیا جائے (۸ : ۴۱)

ضمنیات

قصۂ آدم | حقیقتِ آدم کا تمثیلی بیان ہے جس سے خودی کا احساس اور اس کی آرزوئے بازگشت پیدا ہو

تو غیب سے ندا آتی ہے ——— اے آدم! تو میری تخلیق کا شاہکار ہے (٩٥/٤)۔ میں نے تجھ میں اپنی روح پھونک دی ہے اور ملائکہ کو تیرے سامنے سجدہ ریز رہنے کا حکم دے دیا ہے (٣٨/٧٢)۔ ارض و سموات اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے تیرے لیئے قابلِ تسخیر ہے (٢/٣٠ ، ١٢-١٣/٤٥) تیری یہ حالتِ ارضی ایک مدت کے لیئے عارضی ہے (٢/٣٦)، یہ دور تیرے امتحان و آزمائش کا ہے (٦٧/٢) اپنی حقیقت کو پہچان اور اپنی منزلِ مقصود کو نگاہ میں رکھ کہ تیرا اِستقرار ابدی ہے۔ (١١/٣٠) تجھے درجہ بدرجہ بلندیوں کی طرف اٹھنا ہے (٨٤/١٩)۔ اگر تو حسنِ کامل بن کر اپنی حقیقت کی طرف لوٹنا چاہتا ہے تو میری وحی پر یقینِ محکم رکھتے ہوئے مصروفِ عمل رہ ورنہ تو اسفل سافلین کی حالت سے نجات نہ پا سکے گا۔ (٩٥/٤-٥)۔ میرے قرب کی تمنا ہے تو خود میں میری صفات پیدا کر۔ (٢/١٣٨)۔ حزن و ملال سے بچنا چاہتا ہے تو میرا ولی بن جا (١٠/٦٢)۔ پھر تیری آرزوئے حصولِ حیاتِ جاوداں پوری ہوگی اور شہوات و نشاطِ زدا سے پاک ہو کر (٣٥ — ٢٢) اپنی حقیقت میں منازلِ زیست کا پیکرِ بے مثال ہوگا۔ (٩٥/٤) حیاتِ ارضی میں تیری پستی کا سبب عدولِ حکم ہی ہے۔ اگر تعمیل ہو تو تیری ذات

آلودگیوں سے پاک اعلیٰ و رفیع مقام پر ہے اور بالآخر تجھے تیری حقیقت کی طرف
لوٹا دیا جائے گا (۹۵/۷-۶ ، ۲۲-۱۹) ۔

کثافتِ بدن کو لطافتِ روح میں تحلیل کر کے محسوس کیجئے حیاتِ ابدی
کی آرزو میں اس کشتی کی طرح جیون کی ہر دھڑکن کے تیز بن سے قرار پانے والے نطفہ
سے لے کر جنم، پرورش، جوانی، پیری اور موت تک کی تمام کڑیاں باہم مل کر ذی
گوشت پوست، غلاظت اور مشقت سے مخلوط زندہ گوشت کے ایک لوتھڑے
سے زیادہ اور کچھ ثابت کر سکیں گی ـــ روح بے قرار ہو کر اپنے لیے
ایک ایسے مسکن کی جویا ہوگی جہاں حسن و زیبائی کی بلند ترین صورت میں اسے ابدی
قرار حاصل ہو!

ہابیل اور قابیل؟

انسان کے ہاتھوں انسان کے قتل ہونے
کا یہ پہلا واقعہ ہے تمثیلی ہے قرآن نے آدم
کے دو بیٹوں کا ذکر کیا ہے ان دونوں میں سے ایک بیٹا انسان کے مثبت
اور منفی پہلو کا مظہر ہے۔ اس تمثیل کی غایت یہ ہے کہ وجہ قتل حسد قرار دیا
ہے۔ اور حسد کی بنا میں تنگ نظری پیدا ہوتی ہے!

اس سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ حسد فی زندگی کا ایک بنیادی سبب
ہے جو انفرادی قتل سے لے کر بین الاقوامی سطح تک جنگ و قتال میں منتج ہوتا
ہے۔ اور یہ کہ انسانوں کے درمیان بغض و نفرت پیدا کرتا ہے حتیٰ کہ اللہ در آخرت
پر یقین کرنے والوں کو حق سے باز رکھتا ہے۔ (۵/۳۰-۲۷ ، ۲/۱۰۹ ، ۴/۵۴)
اسی لئے حسد سے بچنے کی بنا میں آسمانی وحی نے ہدایت دی ہے۔
(۱۱۳/۵) ۔

اس مثال سے یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ جو عمل خدا کے ہاں قبولیت نہ

دکھائی دیتے ہوں نتائج کا دار و مدار انسان کی سیرت و ایمان پر ہوتا ہے.... اور یہ کہ مجرم انسان حیوان سے بھی بدتر ہے اور اس کی عقل بھی عقلِ حیوانی سے کمتر ہو جاتی ہے۔ ...اور یہ کہ اگر انسان میں ندامت کا عنصر نہ ہوتا تو دنیا میں درندگی اور دہشت پھیل جاتی اور یہ کہ مجرم انسان کے دل میں انسانوں کا خوف اللہ کے خوف سے زیادہ ہوتا.... اور یہ کہ مجرم اگر دنیا میں سزا سے بچ بھی جائے تو آخرت میں عذاب دوزخ سے نہیں بچ سکتا۔

ذکر اس طرح ہے کہ آدمؑ کے دو بیٹوں نے اللہ کے نام پر قربانی دی۔ ان میں سے ایک متقی تھا جس کی قربانی اللہ کی درگاہ میں قبول ہوئی۔ دوسرا بدنیت و بدکردار تھا اس کی قربانی قبول نہ ہوئی۔ حسد کے جذبات ابھرے اور اپنے بھائی کو قتل کر دینے کی دھمکی دینے لگا۔ وہ متقی بھائی کہنے لگا۔ تو بے شک مجھے قتل کر دے میں تجھ پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میرے دل میں اللہ کا خوف جاگزین ہے۔ اور اگر تو ایسا کرے گا تو اچھا ہے کہ تیرے گناہوں میں میرے قتل کے جرم کا اضافہ ہو اور تو ظالم ثابت ہو کر جہنم میں جائے۔ حسد سے مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر مایوسی جذبۂ انتقام ابھار کر سرکش کر دیتی ہے۔ (ابلیس کے لغوی اور ابلیس کے معنی مایوس کے ہیں۔ شطن کے معنی سرکشی اور شیطان کے معنی سرکش کے ہیں۔ ابلیس اور شیطان ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں)۔ مایوسی سے سرکشی کے جذبات ابھرے اور بھائی نے بھائی کو قتل کر دیا۔ پھر دوسروں سے جرم چھپانے کی تدبیریں کرنے لگا لیکن کچھ نہ سوجھا تو دیکھتا ہے کہ ایک کوا زمین کرید رہا ہے۔ مجرم انسان کو حیوان نے تدبیر سمجھائی۔ بھائی کی لاش کو زمین میں دفن کرتے ہوئے پشیمانی کے عالم میں سوچتا ہے کہ میں ایک کوے سے بھی کمتر ہوں؟ (۵/۲۷-۳۱)۔

قارون

حضرت موسیٰؑ کی قوم میں سے تھا۔ حرص و ہوا کا نمونہ، سرکش و نافرمان تھا۔ لوگوں کا استحصال کر کے دولت جمع کرتا تھا جس کے سبب مال و دولت کی اتنی فراوانی ہو گئی تھی کہ اس کے خزانے کی کنجیاں ایک بارِ گراں تھیں اور اسے اپنی دولت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ لیکن اُس وقت خدا ترس لوگ اُسے نصیحت کرتے کہ اپنی دولت پر اترانے کی بجائے تو اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کر کے دنیا و آخرت کی بھلائی خرید اور اللہ کا احسان ناشناس نہ ہو۔ قارون جواب میں کہتا یہ دولت تو میں نے اپنی عقل و دانش سے فراہم کی ہے۔ اس میں اللہ کا کیا دخل ہے۔ دولت کے نشے میں یہ نہ سوچتا تھا کہ اس سے کہیں زیادہ دولت و قوت رکھنے والے سرکشی اور تکبر کی بنا پر تباہ ہو چکے ہیں۔

ایک دن جب وہ قارون بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ نکلا تو حریص لوگ اس کی جاہ و حشمت کو دیکھ کر کہنے لگے۔ کاش! ہم بھی قارون کی طرح خوش نصیب ہوتے۔ حق شناس لوگوں نے کہا۔ افسوس ہے تم پر، کیا تم اس دولت و حشمت پر مرتے ہو جبکہ اس سے بہتر بات ہے جو ایمان والوں کے لیے اللہ کے پاس ہے، وہ ملے گی تو صرف صابروں کو۔ چند لمحوں بعد دیکھتے ہیں کہ قارون اپنی دولت و حشمت کے ساتھ زمین میں دھنسا جا رہا ہے اور اسے بچانے والا کوئی نہیں۔ یہ دیکھ کر قارون کی زینت دیکھنے والے پکار اٹھے، شکر ہے اللہ کا ہم قارون جیسے نہ تھے ورنہ ہمارا بھی یہی حشر ہوتا اور نجات نہ پا سکتے۔ (۲۸ : ۷۶-۸۲)

دولت مند و خوشحال اور قارون کی زینت رکھنے والے حریص لوگوں کے لئے اگرچہ یہ واقعہ باعث عبرت ہے اور اس میں حق شناسوں کے واسطے عبرت و ہدایت کے اشارات موجود ہیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ سرکشی اور استحصال سے دولت جمع کرنا تباہی ہے

۲:۔ دولت کی فراوانی باعث تکبر ہوتی ہے۔

۳:۔ خسیس اور مکر و فریب سے دولت جمع کرنے والے اسے عقل و دانش سمجھتے ہیں۔

۴:۔ خدا ترس لوگ نہ حریص ہوتے ہیں نہ دولت جمع کر کے رکھتے ہیں وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔

۵:۔ دولت و حشمت کا بالآخر انجام تباہی و بربادی ہوتا ہے۔

۶:۔ دولت و حشمت کسی کو تباہی سے نہیں بچا سکتی۔

اصحابِ کہف

اکثر لوگ ان کے ذکر کو مافوق الفطرت خیال کرتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔

واقعہ اس طرح ہے کہ مشرک لوگوں کی ایک بستی میں کئی جوان تھے جو صحیح ایمان رکھتے ہوئے توحید پرست تھے۔ لوگوں کے کفر و شرک سے بیزار تھے مگر بے بس تھے۔ آپس میں مشورہ کر کے ایک منصوبہ کے تحت بستی سے نکل گئے اور ایک غار (کہف) میں جا چھپے۔ غار کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ طلوع و غروب آفتاب تک کے اوقات میں باہر سے دیکھنے والے کو یوں نظر آتا تھا کہ غار کے اندر مقیم ان میں سوتے ہوئے جاگ رہے ہیں اور کروٹیں بدل رہے ہیں۔ ان کا کتا غار کے منہ پر پاؤں پھیلائے پڑا رہتا۔ ایک ہیبتناک منظر تھا جو دیکھنے والے پر دہشت طاری کرتا اور تھا اور حکمتِ خداوندی سے یہ ان کی حفاظت کا ذریعہ تھا۔

واضح یہ ہوتا ہے کہ وہ جوان زیادہ کوشش میں رہتے تھے کہ ان کی دسترس میں جو لوگ قابل صدق تھے ان کو توحید پرستی کا سبق دے کر ان کو دین سکھاتے اور ان میں غیرت کا مادہ پیدا کرتے۔

اللہ کی مدد شامل حال ہوگی!

خواجہ خضر؟

حضرت موسیٰؑ نے ایک دفعہ اس بندۂ خدا کی تلاش میں سفر اختیار کیا جس کو اللہ نے اپنی خاص رحمت سے علم بخشا تھا۔ (قرآن میں آپ کا نام نہیں آیا!) راستے میں اپنے خادم سے کہنے لگے۔ میں جب تک دو دریاؤں کے ملنے کے مقام پر نہ پہنچ جاؤں سفر جاری رکھوں گا اگرچہ میری تمام عمر اس میں گزر جائے۔ چلتے چلتے تھکاوٹ محسوس ہوئی تو سستانے بیٹھ گئے۔ پھر سفر اختیار کیا اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد خادم سے کہا۔ وہ مچھلی نکالو تاکہ کھا کر تازہ دم ہو جائیں۔ خادم نے کہا۔ وہ مچھلی تو اس جگہ پانی میں کود گئی جہاں سستانے بیٹھے تھے اور میں آپ کو بتانا بھول گیا۔ کہنے لگے۔ وہی تو ہمارے سفر کی منزل مقصود تھی اور اس جگہ پر لوٹ گئے جس کی تلاش تھی وہ بندۂ خدا انھیں مل گیا۔

موسیٰؑ نے بندۂ خدا کے سامنے خواہش ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ میں آپ کے ساتھ رہ کر اس علم میں سے کچھ سیکھنا چاہتا ہوں جو اللہ نے اپنی خاص رحمت سے آپ کو بخشا ہے۔ جواب ملا۔ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر و تحمل سے کام نہ لے سکیں گے۔ موسیٰؑ نے اس کا یقین دلایا اور ہم سفر ہو گئے۔

ایک مقام پر پہنچے جہاں ایک کشتی کھڑی دیکھی۔ بندۂ خدا نے اس میں شگاف کر دیا۔ موسیٰؑ صبر نہ کر سکے اور کہا۔ آپ نے تو لوگوں کے ڈوبنے کا سامان پیدا کر دیا آپ نے بہت برا کیا۔ جواب میں آپ کو عہد یاد دلایا گیا تو ندامت ظاہر کی اور سفر جاری رہا۔ پھر ایک مقام پر پہنچے جہاں ایک نوجوان کو دیکھا اور بندۂ خدا نے اسے قتل کر دیا۔ موسیٰؑ بڑے مضطرب ہو کر کہنے لگے۔ آپ نے ایک بے گناہ کا خون کر کے بہت برا کیا۔ جواب میں پھر عہد یاد کرایا گیا تو پشیمان ہو کر کہا۔ آئندہ ایسا کروں

پھر اس نے مشرق کی طرف سفر اختیار کیا اور اتنی دُور چلا گیا جہاں طلوعِ آفتاب کی کوئی اوٹ نہ دکھائی دیتی تھی۔

پھر اس نے ایک اور سفر اختیار کیا اور دو پہاڑوں کے درمیان پہنچ گیا جہاں دیکھتا ہے کہ ایک جاہل بے علم قوم آباد ہے۔ وہ لوگ ذوالقرنین سے کہنے لگے ہماری سرزمین پر یاجوج وماجوج کے گروہ حملہ آور ہو کر تباہی مچا دیتے ہیں آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایسی دیوار تعمیر کروا دیں جو ہمیں ان سے محفوظ کر دے۔ اس کے لیے جتنا بھی خرچ پڑے ہم برداشت کریں گے۔ ذوالقرنین نے کہا خرچ کرنے کا مقدور اللہ نے مجھے بے شمار عطا کیا ہے۔ تم لوگ مجھے جسمانی مدد دو میں دیوار بنوائے دیتا ہوں۔ چنانچہ لوہے کے تختے تیار کر کے دونوں پہاڑوں کے درمیان کھڑے کر دیئے گئے اور انہیں دھونک کر پگھلا ہوا تانبہ ان پر انڈیل دیا گیا۔ اس کے بعد یاجوج وماجوج کو یہ طاقت نہ رہی کہ اس دیوار کو پھاند کر یا اس میں نقب لگا کر حملہ آور ہو سکیں۔ —— جب اللہ کے سچے وعدے کا وقت آن پہنچے گا تو یہ دیوار گر کر ہموار ہو جائے گی اور یاجوج وماجوج زمین پر پھیل کر تباہی مچا دیں گے۔ پھر صور پھونک دیا جائے گا اور سب لوگ جمع کر دیئے جائیں گے اور جہنم کافروں کے سامنے لائی جائے گی۔ ($\frac{۱۸}{۸۳ - ۱۰۰}$)

(تاریخی و جغرافیائی لحاظ سے مطالعہ کیا جائے تو یاجوج وماجوج کا اشارہ موجودہ چین اور روس کی طرف ہے)

چند وضاحتیں

ملائکہ اللہ، کتاب، رسالت اور آخرت پر ایمان رکھنے کے ساتھ ملائکہ پر بھی ایمان لانا قرآن نے فرض قرار دیا ہے (۲/۲۸۵)۔

حرکت داخلی ہو یا خارجی بوجہ توانائی ہے۔ حرکت کی پذیرائی محسوس کی جا سکتی ہے اور اس کے نتائج کو دیکھا جا سکتا ہے لیکن توانائی بذاتِ خود دکھائی نہیں دیتی۔ قرآن نے ان قوتوں (توانائیوں) کو ملائکہ کے نام سے متعارف کیا ہے۔ مثال کے طور پر مشینوں کا خالق انسان ہے۔ جس قوت سے یہ حرکت کرتی ہیں اُسے اسپی قوت (ہارس پاور) کہتا ہے۔ کم و بیش قوت کے نتائج حاصل کرتا ہے لیکن اسپی قوت (یا ہارس پاور) کو دیکھ نہیں سکتا۔ جو خالق خود اپنی تخلیق کی ہوئی قوت کو نہیں دیکھ سکتا وہ خالقِ اعلیٰ کی خلق کی گئی قوتوں (ملائکہ) کو کیونکر دیکھ سکتا ہے!

ملائکہ تخلیق آدم سے پہلے موجود تھے۔ (۳۸/۷۱ - ۷۲)۔

اللہ نے ملائکہ کو (تا قیامت) انسان کے سامنے سجدہ ریز رہنے کا حکم دے رکھا ہے۔ (گویا یہ قوتیں انسان کے لئے قابلِ تسخیر ہیں) (۲/۳۱ - ۳۲، ۱۸/۵۰)۔

ملائکہ وہ بھی ہیں جو نظمِ کائنات میں اللہ کے حکم سے وجہ تدبیر و تقسیم ہوتے ہیں (ان پر انسان کو جبر نہیں ہے)۔ (۵۱/۴، ۷۹/۵)۔

پیغمبروں پر اللہ کی وحی لانے والے ملائکہ تھے۔ (۵/۹۰ - ۱۰۸)۔

انسان کے اعمال لکھنے والے ملائکہ ہیں (۱۰/۲۱، ۱۷/۱۳-۱۴، ۱۹/۷۹، ۴۳/۸۰)

انسان کی ذات میں نفسیاتی تغیرات کا موجب ملائکہ ہیں۔ (۳/۱۲۵-۱۲۶، ۸/۹-۱۲، ۴/۴۲-۴۴، ۹/۲۶، ۴۱/۳۰)

موت سے ہمکنار کرنے والے ملائکہ ہیں (۶/۹۰، ۱۶/۲۸)

نظامِ کائنات بحکمِ خداوندی بذریعہ ملائکہ کس طرح چل رہا ہے اس کا علم خالق اعلیٰ ہی کو ہے۔ انسان اپنی ذات اور اشیاء کا علم حاصل کر کے اور ان کا تجزیہ کر کے جو "ملائکہ" اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں وہ ان سے جس طرح چاہے کام لے سکتا ہے۔

انسان بہشتی فاعل تین قوائے محرکہ کا حامل ہے۔

۱ ـــــــــ مثبت قوت (ملکوتی قوت) جو فہم و امتیاز، حبِ علم اور عدل کا ماخذ ہے۔

۲ ـــــــــ منفی قوت (شیطانی قوت) جو نفس پرستی، اشتباہ، بدی اور سرکشی کا ماخذ ہے۔

۳ ـــــــــ حیوانی قوت جو غضب، شجاعت، اقتدار، بلند ہمتی اور جذبۂ شہوانی کا ماخذ ہے۔

پہلی قوت کو اگر انسان تیسری قوت پر غالب رکھتے ہوئے فاعل ہے تو نتیجہ مثبت صورت میں برآمد ہوگا۔ اگر دوسری قوت کو بروئے کار لا کر تیسری قوت سے کام لے گا تو نتیجہ منفی ہوگا۔ (خیال رہے کہ مثبت اور منفی سے مطلب خیر اور شر ہے)

اشیائے کائنات اپنی اپنی خصوصیات کی حامل ہیں اور بے اختیار مصروفِ عمل ہیں۔ ان سے کام لے کر مثبت یا منفی نتائج حاصل کرنے ہیں

انسان بااختیار ہے۔

شیطان یا ابلیس

ملائکہ کو جب اللہ کی طرف سے آدمؑ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم ملا تو سب نے تعمیل کی سوائے ابلیس کے (۲/۳۴)۔ خبر سے کہ ابلیس کا شمار ملائکہ ہی میں ہوتا ہے۔ ابلیس جنات میں سے ہے (۱۸/۵۰) اور جنات کی تخلیق آدمؑ سے پہلے دہکتی آگ سے ہو چکی تھی۔ (۱۵/۲۶-۲۷)۔ سو جو حکم ملائکہ کو ملا اس میں فرشتے، جنات اور جنات میں سے ابلیس سب شامل ہیں۔ گویا یہ مثبت اور منفی غیر مرئی قوتیں ہیں جن کو آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم ملا۔ دوسرے الفاظ میں ان غیر مرئی کائناتی قوتوں کو انسان کے لیے قابلِ تسخیر کر دیا گیا۔

ان غیر مرئی قوتوں کی ماہیت کو انسان نہیں سمجھ سکتا۔ ان کے بارے میں جتنا کچھ وحی سے معلوم ہوتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کے اندر جو اُلوہیاتی توانائی موجود ہے اگر اس کو انسانی توانائی کے ساتھ بیدار رکھ کر ان قوتوں سے کام لے تو نتائج مثبت اور تعمیری ہوں گے اور اگر انسانی توانائی کے ساتھ اُلوہیاتی توانائی کو بیدار نہ رکھے تو نتائج منفی اور تخریبی ہوں گے۔

انسان کے اندر خیر و شر یا حق و باطل کی کشمکش مسلسل جاری ہے۔ وہ خداداد عقل و علم کی قوت سے کائناتی قوتوں کو مسخر کر کے ان سے کام لے تو اسے انسانیت کا درجہ حاصل ہے۔ اگر اپنے اندر قوتِ خیر (جو اُلوہیاتی توانائی کا مأخذ ہے) کو قوتِ شر (جس نے اللہ سے بغاوت کر رکھی ہے) پر غالب رکھتے ہوئے کائناتی قوتوں سے کام لے تو اسے مقامِ مومن حاصل ہے۔ جو لوگ نہ کائناتی قوتوں سے کام لیں نہ قوتِ شر پہ غالب ہوں ان کا مقام خود متعین کر لیں۔

جادو (سحر)

کے بنیادی معنی دھوکا یا فریب کے ہیں۔ آج وہ معاشرے میں پاکیزہ شخصیت "جادو" کا اثر رکھتی ہے۔ گمراہ لوگوں کا پیغمبر کو جادوگر اور وحی کو جادو قرار دینے کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ گویا گمراہوں کے لیے ہدایت "جادو" ہے۔ فرعونی جادوگروں کے مقابلے میں حضرت موسیٰ کی فتح کا ذکر بھی آپ نے پڑھا ہے۔ (۲۰/۶۵-۶۹) (حالانکہ یہ اللہ کی طرف سے ہدایت کی نشانیاں تھیں جن کو فرعون اور اس کی قوم جادو کہتے تھے۔ عہد سلیمانی میں جادو کا ذکر آپ نے پڑھا ہے (۲/۱۰۲)

ہماری دنیا میں غیر عام شخصیت، حسن، گفتار، رفتار، اور کئی مظاہر جو غیر معمولی ہوں 'جادو' کا اثر رکھتے ہیں۔ وحی نے جادو کے اثر سے بچنے کے لیے انسان کو اللہ کی پناہ مانگنے کی ہدایت دی ہے۔ (۱۱۳/۴) غیر اسلامی مذاہب کے فریب میں گرفتار ہو کر انسان گمراہ ہو جاتا ہے۔

مذہبی دنیا میں انسانیت کو گمراہ کرنے کا ذریعہ سحر کاری ہے (عنوان تعارف دیکھیے)

وحی کی پیروی کرنے والا تربیت یافتہ نفسِ انسانی کسی قسم کے جادو سے متاثر نہیں ہوتا۔

محکمات و متشابہات

کتاب اللہ کی بعض آیات محکمات ہیں (جن کے معنی واضح اور صاف ہیں) اور بعض متشابہات ہیں (جن کے معنی صاف اور واضح نہیں ہیں) متشابہات کو سمجھنے کے لیے علم میں پختگی درکار ہے۔ سو جب تک ایسا نہ ہو ان پر ایمان رکھنا کہ یہ اللہ کی طرف سے وحی کا حصہ ہیں، واجب ہے اور محکمات پر عمل کرتے رہنا چاہیے۔ دل کی کجی میں متشابہات کے اتباع سے فساد کا اندیشہ ہوتا ہے۔ (۳/۷)

قرآن آیاتِ وحی میں غور و فکر کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اگر آج ایک آیت کسی کے لئے متشابہ ہے تو غور و فکر کرنے سے کل وہ محکم ہو سکتی ہے۔ اور اسی طرح غور و فکر جاری رکھنے سے متشابہات محکمات میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جو کتاب شکوک و شبہات سے پاک ہے اور متقین کے لئے مکمل ہدایت ہے (۲/۲) اس کی کوئی آیت حقیقتاً متشابہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن کوئی شخص بیک وقت یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ اس کے لئے تمام آیات محکمات ہیں۔ حیاتِ کائنات کو تمام تر تقاضوں کا مکمل حل اس وقت حاصل ہوا جب وہ اپنے معراج پر تھی۔ قرآن کی جملہ آیات معراجِ انسانیت کے لئے تو بیک وقت محکمات ہو سکتی ہیں لیکن حصولِ معراج کے آرزومندوں کے لئے نہیں ہیں۔

ایمان پختہ ہو اور عمل جاری رہے تو متشابہات راہ میں ہرگز حائل نہیں ہوتیں۔ بس محکمات پر عمل کرتے جایئے اور متشابہات پر غور و فکر کرنا چھوڑیئے رفتہ رفتہ متشابہات محکمات میں تبدیل ہوتی جائیں گی۔

دُعا تمنا، آرزو، التجا، خواہش اس کے مفہوم میں شامل ہیں دعا کرنا یا دعا مانگنا اور ایک دوسرے کو دعا دینا انسانی زندگی کا معمول ہے البتہ مختلف لوگوں میں جو الفاظ ایک دوسرے کو دعا دیتے ہوئے ادا کیئے جاتے ہیں وہ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ انفرادی زندگی سے لے کر بین الاقوامی سطح تک ایک دوسرے کے لئے نیک خواہشات کا اظہار سب کے مشاہدے میں ہے۔ اکثر اوقات اس میں محض تکلف ہوتا ہے بعض اوقات منافقت ہوتی ہے اور گاہے خلوص بھی ہوتا ہے۔

مذہبی دنیا میں لوگ اپنے اپنے خداؤں سے دن میں مانگتے اور دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ معلوم ان کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ اللہ سے دعا کرنے کے

بارے میں ارشادِ حق قابلِ غور و فکر ہے۔

اے ایمان والو! تم مجھ سے دعا کرو میں سنوں گا لیکن جو لوگ میرے احکام کی تعمیل ازراہِ تکبر نہیں کرتے وہ جہنمی ہیں (ان کی دعا قبول نہیں ہوگی) (۴۰/۶۰)

جب بندہ اللہ کو پکارتا ہے تو وہ اس کی پکار سنتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا ایمان صحیح ہو اور حق کی تعلیم کے مطابق اس نے زندگی کا سیدھا راستہ اختیار کیا ہو (۲/۱۸۶)

اللہ کے حضور اسی صورت دعا قبول ہوتی ہے کہ ایمان کامل ہو اور اعمال صالح ہوں (۴۲/۲۶) استقامت کے ساتھ حق پر عمل کرنے والوں کی دعائیں اللہ کیونکر قبول نہ کرے گا؟ (۱۰/۸۹) بے شک اپنے پروردگار سے چپکے چپکے عاجزی کے ساتھ دعائیں مانگا کرو لیکن یاد رکھو! حدود اللہ سے بڑھنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ دعائیں قبول ہونے کی امید ان لوگوں کو رکھنی چاہئے جو دل میں اللہ کا خوف لئے فساد زندگی کو مٹا کر اصلاح پیدا کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ اس کی رحمت محسنین ہی کے لئے ہے (۷/۵۵-۵۶)

جہاں تک انسان کے لئے انسان کے دعا کرنے کا تعلق ہے اس میں وحدتِ انسانیت کا راز مضمر ہے اگرچہ دعا وفات پا جانے والے کے لئے ہو۔ ایک دوسرے کے لئے نیک خواہشات کے اظہار کا اصل مقصد آپس میں محبت کو بڑھانا ہے اور ایک دوسرے کی ہمت افزائی کرنا ہے۔ محبت اور اعتماد انسان کو انسان میں جذب کر دیتا ہے اور یہ جذبیت موت سے نہیں مٹتی کیونکہ اس کا تعلق روح سے ہے۔ بے شک اس طرح اعمال کے لحاظ سے کسی کی جزا و سزا میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔

لوگ رات دن اللہ سے دعائیں مانگتے رہیں لیکن اس کے احکام کی تعمیل نہ کریں اور اپنی خواہشات وجذبات کی غلامی نہ چھوڑیں تو ایسی دعاؤں کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ خود کو جھوٹی تسکین دے کر اپنے فرائض سے بالکل غافل ہو جائیں؟

تسبیح اور ذکر اللہ

ذکر کے معنی ہیں یاد کرنا، محفوظ کرنا۔ دل میں رکھنا، قوی ہونا، نصیحت پکڑنا، عملاً جاری کرنا۔

ارشاد ہے ——— اللہ کے ذکر سے دل اطمینان پاتے ہیں (۱۳/۲۸) ——— تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا۔ (۲/۱۵۲)

اگر ایک شخص اللہ کو زبان سے یاد کرتا رہے یعنی اس کے ناموں کا ورد کرتا رہے اور دل میں مطمئن ہو تو اس کا حاصل کیا ہوا اور اس سے کسی کو کیا فائدہ؟ اور کیا "اللہ" انسان کا ذکر کرتا ہے تو اس کے کیا معنی؟

مفہوم یہی اخذ ہوتا ہے کہ اللہ کا دین (عملاً) جاری کیا جائے تاکہ سب کے دل اطمینان پائیں۔ اور احکام الٰہی کی پابندی کرنے والوں کی حفاظت کرنا اللہ کا ذمہ ہے!

نشانات غور و فکر کرنے والوں کے لئے ذکر ہیں۔ (۳۹/۲۱)
مقصد حیات حاصل کرنے کے لئے شیطانی قوتوں کے مقابلے میں ثابت قدم رہ کر جدوجہد جاری رکھنا "ذکر اللہ" ہے (۸/۴۵)۔
قرآن غور و فکر کرنے والوں کے لئے ذکر ہے (۴۳/۴۴)۔

حق انسان کی خواہشات پر چلے تو نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے۔ اللہ نے انسان کے لئے ذکر (وحی) اسے پہنچا دیا ہے۔ اور وہ اس سے دانستہ منہ پھیرتا ہے (۲۳/۷۱)۔

احکامِ الٰہی کی پابندی ذکر اللہ ہے (۳۹/۲۲)۔

چونکہ ذکر اللہ اور تسبیح قریب قریب ہم معنی ہیں ذکر اللہ کا صحیح مفہوم تسبیح سے مزید واضح ہو جاتا ہے۔

ارشاد ہے ـــــ زمین و آسمان میں ہر شے اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے۔ (۵۰/۱ ، ۵۹/۱ ، ۶۲/۱ ، ۶۳/۱)

پرندے بھی اپنی اپنی تسبیح و صلوٰۃ سے خوب طرح واقف ہیں اور ہر چیز مصروفِ تسبیح ہے اور یہ سب اللہ کے علم میں ہے (۲۴/۴)۔ (یہاں ذکر و تسبیح کے ساتھ صلوٰۃ کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے یعنی ہر شے اللہ کے حکم (وحی) کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے فرائض ادا کر دیے رہی ہے۔)

رعد و ملائکہ اللہ کی حمد و تسبیح کرتے رہتے ہیں (۱۳/۱۳)۔ (تعمیلِ وحی کرتے ہیں)۔

پہاڑ اور طیور مسخر ہو کر داؤدؑ کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ (۲۱/۷۹)۔

صاف ظاہر ہے کہ ذکر اللہ اور تسبیح کا مفہوم "وحی" کی مکمل طور پر پیروی کرنا ہے۔ صرف ذاکر کے تسبیح کے دانوں پہ اللہ کے ناموں کو دہراتے رہنا محض خود فریبی ہے۔

دراصل قرآن کے بنیادی احکام اور ہدایات کے خاص الفاظ، جملوں اور آیات کے معنی و مفہوم کو کچھ ایسے ڈھنگ سے بدل کر پیش کیا جاتا ہے جو پڑھنے سننے والے جذبات کے خوش کن جنت کے امیدواروں کو پسندیدہ ہوں ورنہ

ایسے درس دینے والوں کی کوئی وقعت نہ رہ جائے اور ان کی دکانیں نہیں چل سکیں"!

صبر و شکر

صبر کے معنی ہیں ثابت قدمی کے ساتھ جدوجہد جاری رکھنا۔ حصولِ مطلب یا مقصد برآوری کے لیے مسلسل مصروفِ عمل رہنا۔ باوجود مزاحمتوں کے قدم جمائے رکھنا اور پیچھے نہ ہٹنا۔ شکر کے معنی ہیں احسان مندی کے جذبات کا اظہار الفاظ و عمل سے کرنا، بھرپور ہو کر ظاہر ہونا۔

حصولِ نصب العین کے لیے جو مومنین استقامت اور ثابت قدمی کے ساتھ جدوجہد جاری رکھتے ہیں اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتے اللہ ان کا مددگار ہوتا ہے (۲/۱۵۳) اور اللہ کے احسانات کی شکرگزاری یہ ہے کہ بندہ اس کی طرف مکمل رجوع رکھتے ہوئے زندگی میں احسن پیدا کرنے کی کوشش میں کمی نہ آنے دے اور اس جذبۂ احسان و عمل کو آنے والی نسلوں میں منتقل کرتا جائے (۲۶/۱۵)۔

زندگی کی مزاحمتوں اور کٹھنوں کے سامنے بے بس ہو کر گھٹنے ٹیک دینا اور یہ کہہ کر کہ "بس میرا تو صبر و شکر ہے" خود کو جھوٹا مطمئن کر دینا مردِ خدا کا شیوہ نہیں ہے بلکہ شکست خوردہ اور پست ذہنیت کی علامت ہے۔

دنیا کی نعمتیں حاصل کر کے ایک شخص اگر زبان سے اللہ کا شکر ادا کرے لیکن جذبات کی غلامی میں ان سے خود محظوظ ہو اور دوسروں کو ان میں شریک نہ کرے تو وہ شخص خود فریبی میں مبتلا ہوا اور ہرگز اس نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا بلکہ اللہ کے عذاب کو دعوت دی (۱۴/۷)۔

عام طور پر صبر کے معنی جو لیے جاتے ہیں وہ اس کے معنوں کے برعکس ہیں جو انسان کو بےکس بےبس کر دیتے ہیں۔

دولت حاصل کر کے عیش اڑانا اور اسے جمع کر کے رکھنا اور پھر خود کو ست کر سمجھنا اور کہلوانا اور محروموں کو صبر کی تلقین کرتے رہنا۔ یہ فریب کا بڑا عالم ہے!

توبہ

استغفار کے معنی ہیں غلطی کرنے یا غلط راستہ اختیار کرنے کے بعد اس کا احساس کرتے ہوئے درستی کر لینا یا صحیح راستے پر پلٹ آنا۔

مسلسل ارتکابِ جرم کے ساتھ ساتھ "استغفر اللہ" کا وِرد بھی جاری رکھنا توبہ نہیں خود فریبی اور خدا فریبی ہے۔

مغفرت کے معنی ہیں حفاظت یا پناہ۔ غفور ـــــ حفاظت دینے والا۔ استغفار۔ حفاظت طلب کرنا ـــــ کیا کسی عادی مجرم کو استغفار پڑھنے سے اس غفور کی مغفرت حاصل ہو سکتی ہے؟

ایک متقی سے اگر صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے کوئی لغزش ہو جائے اور فوراً سنبھل کر توبہ کر لے تو اس کی توبہ قابلِ قبول ہو سکتی ہے کیونکہ وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا (نہ عادی مجرم ہوتا ہے) اور اللہ خوب جانتا ہے کہ متقی کون ہے اور کون نہیں ہے۔ (۵۳/۳۲)۔

انسانی ذات کی تین نفسیاتی کیفیات کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔

۱۔ نفسِ امارہ جو انسان کو برائی کی طرف مائل کرتا ہے لیکن اس کا غلبہ ان لوگوں پر نہیں ہوتا جو راہِ حق اختیار کئے ہوتے ہیں (۱۲/۵۳)۔

۲۔ نفسِ مطمئنہ جو راضی بہ رضا ہو کر الٰہی حقیقت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ (۸۹/۲۷-۳۰)۔

۳۔ نفسِ لوامہ جو حق کے راستے پر چلتے ہوئے اگر لغزش ہو جائے تو ندا

ہو کر سنبھل جاتا ہے۔ اور یہی النفسِ لوّامہ کی خدا نے قسم کھائی ہے۔ (۷۵/۲)۔

جو لوگ نفسِ امّارہ سے مغلوب ہو کر مسلسل گناہ گار ہیں ان کی توبہ قبول نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ نمازی ہوں اور رات دن "استغفر اللہ" کا ورد کرتے رہیں۔

جہاں یہ عقیدہ ذہن نشین کر دیا جائے کہ فلاں وقت اتنی تسبیح "استغفر اللہ" پڑھنے سے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں تو اندازہ لگائیے کہ نتیجہ کیا ہوگا۔ اور اندازہ لگانے کی بھی ضرورت کیوں ہو ہم خود اس کی جیتی جاگتی تصویر ہیں!

اِلّا ماشاء اللہ ادھر صرف زبان اور اللہ کا ورد جاری ہو ادھر جھوٹ، فریب، دھوکا، رشوت، چوری، فحاشی، اذیت رسانی، منشیات، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، ظلم اور فساد کی روا داری ہو تو کیا ایسی توبہ قبول ہو جائے گی؟

کسی ناصح سے کوئی دل جلا پوچھے کہ ایسا کیوں ہے؟ تو جواب ملتا ہے "لوگوں کو ہم برائیاں کرنے کی ترغیب نہیں دیتے"۔ ان سے کون کہے کہ یہ ان غلط عقائد کا نتیجہ ہے جو بے علم لوگوں کے دلوں میں "علم والوں" نے بٹھا دیئے ہیں۔

اس بدنصیب قوم کے بگاڑ کو سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے جس کی امیری یا فقیری، عیاری سلطانی ہے یا عیاری درویشی۔

عبادت کے معنی ہیں برضا و رغبت اطاعت کرنا، حکم کی تعمیل کرنا، سرِ تسلیم خم کر کے فرمانبرداری کرنا، پرستش کرنا۔

عبادت کا مفہوم صرف پرستش کرنا نہیں جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔ پرستش کا تعلق جذبات سے ہے۔ کشش و جاذبیت دل میں اتر جاتی ہے تو انسان پرستش

توکّل سہارا، اعتماد، بھروسہ، نگرانی، سپردگی سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔

انسان محنت کرکے علم حاصل کرتا ہے۔ علم کے سہارے آئینِ فطرت پر اعتماد کرتے ہوئے فاعل بنتا ہے۔ اور معاوضے کے لیئے فعل کے نتائج کو فطرت کی نگرانی کے سپرد کر دیتا ہے۔ جو انسان محنت ہی نہ کرے اور توکل بر خدا کرتے ہوئے بیٹھے بٹھلائے نتائج یا معاوضے کی توقع رکھے یہ توکل بر خدا نہیں دروغ بر خدا ہے۔

توکل کا غلط مفہوم سمجھ لینے کے نتائج تساہل، محنت سے گریز، بے روزگاری، جہالت، گداگری اور پسماندگی ہوتے ہیں۔ (جن سے ہم دوچار ہیں)

والدین بچے کی پرورش میں مشقت نہ اٹھائیں گے تو وہ نحیف و ناتواں اور بیمار بن کر رہ جائے گا۔

ذہین بچے تعلیم حاصل کرنے میں محنت سے گریز کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ معاشرہ جہالت اور آوارگی سے دوچار ہو جائے؟

جوانی تن آسان ہو تو بستیاں تباہ ہو کر ویران ہو جاتی ہیں۔

ضعفِ پیری توکل پہ مجبور کرے تو روا ہے۔

غور کیا جائے تو آئینِ فطرت سے ہم آہنگ ہو کر محنت ہی کیا جانا خالقِ فطرت پر توکل کرنے کے مترادف ہے۔ اس لحاظ سے کافر کا توکل نادانستہ آئینِ فطرت پر ہوتا ہے اور مومن کا توکل دانستہ آئینِ فطرت کے ساتھ خالقِ فطرت پر بھی ہوتا ہے۔

محنت اور توکل لازم و ملزوم ہیں۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سے ذہن نشین

کے لئے مسلسل جد وجہد کرتے رہیں۔ اور بین الاقوامی امن اور وحدتِ انسانیت کی کوشش کرتے رہنا وحی کی رو سے صالح اعمال ہیں۔

عقل و علم

عقل کے معنی ہیں روکنا، منع کرنا، سمجھنا، پابند رہنا، غور و فکر کا ذریعہ۔ علم کے معنی ہیں ادراکِ حقیقت اچھی طرح جاننا اور پہچاننا، مکمل اور محکم طور پر معلوم کرنا۔

عقل حیوانوں میں بھی ہے لیکن جبلی طور پر (پابندی، بے اختیار) کار فرما ہے۔ انسان وحی کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے میں با اختیار پیدا کیا گیا ہے لیکن اگر وہ عقل سے کام نہ لے، نہ علم حاصل کرے نہ غور و فکر کرے تو وہ حیوان سے بدتر ہے (۸/۲۲) اور اگر عقل سے کام لے لیکن اسے وحی کے تابع نہ رکھے تو ناکام ہے (۵/۲۸)۔ ملائکہ بنی آدم کے سامنے صرف اس کے علم سے بہرہ ور ہونے کی وجہ سے سجدہ ریز ہیں (۲/۳۴) ہم حیوان سے بدتر کے سامنے ملائکہ کیونکر سجدہ ریز ہوں گے؟ علم وجہ شرفِ انسانیت ہے اور وحی کا اتباع انسان کو ظلم وفساد سے محفوظ رکھتا ہے۔

آج ہمارے سامنے وہ قومیں موجود ہیں جو عقل سے کام نہ لینے کے سبب حیوانوں سے بدتر زندگی بسر کرتی ہیں اور وہ قومیں بھی جو عقل سے کام لینے کے باعث ترقی یافتہ ہیں لیکن وجہ ظلم و فساد ہیں کیونکہ وحی سے باغی ہیں۔

فرد ہو یا قوم حصولِ علم کا ذوق مفقود ہے تو حیوانوں سے بدتر ہے۔ علم سے بہرہ ور ہے مگر وحی کی تعلیم (ہدایت) سے آشنا نہیں تو اس کا انجام غیر مشتبہ ہے!

قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ دیکھتے ہیں کہ مختلف پیرایوں میں

سے کام لینے، غور و فکر کرنے، تدبّر اور سوچ بچار کرنے اور بصیرت سے کام لینے کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔ کہیں اس سے مقصد آیاتِ وحی کے اصل مفہوم کو سمجھنا ہے اور کہیں تخلیق اور اشیائے کائنات کا علم حاصل کرنا ہے مقصود اس سے یہ ہے کہ دین کے علم کے ساتھ دنیوی علوم حاصل کرکے ارتقائے حیات کے لئے جدوجہد کی جائے تاکہ شرفِ انسانیت حاصل ہو اور زندگی شر و فساد سے محفوظ رہ کر حصولِ نصب العین کے لئے رواں دواں رہے۔

علم نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی کوشش جاری رہنی چاہیئے۔ (۲۰/۱۱۴)۔

وہ شخص غلط فہمی میں مبتلا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ علم میں کامل ہے۔ ایک علم والے سے دوسرا علم والا بڑھ کر (موجود ہوتا) ہے۔ (۱۲/۷۶)۔

بے علم کا علم والے کے مقابلے میں کوئی مقام نہیں ہے۔ عالم و جاہل برابر نہیں ہو سکتے۔ (۳۹/۹)۔

انسان کے لئے جہالت ایک لعنت ہے لیکن قرآن کی رو سے وہ لوگ بھی لعین و جاہل ہیں جو وحی کی تعلیم سے ناآشنا ہیں اگرچہ علم رکھنے والے ہوں۔ (۳۳/۲۲)۔

بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح مدنظر ہو تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ فوری طور پر جرائم کو بڑی سختی کے ساتھ روکا جائے اور ساتھ ہی ابھرتی ہوئی نسل کی تعلیم و تربیت کا یہ بندوبست کیا جائے کہ لڑکے اور لڑکیاں جدید دنیوی علوم حاصل کرنے کے ہمراہ وحی کی صحیح تعلیم سے بھی بہرہ ور ہوں اور ایسی تربیت پا کر ابھریں جس سے ان کی سیرت و کردار کو مثالی حیثیت حاصل ہو۔

تقدیر

خالق رحمٰن و رحیم اپنی مخلوق کی بھلائی چاہتا ہے۔ زندگی کی باطل راہ اختیار کرنے کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر کے اس سے باز رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اور راہِ حق کے خوش گوار نتائج سے آگاہ کر کے اسے اختیار کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ لیکن اس کے لئے کسی کو مجبور نہیں کرتا (۱۸/۲۹)۔ جو اپنی بھلائی چاہتا ہے اور انسانیت کی بہتری مد نظر رکھتا ہے وہ خود بھی وحی کی پیروی کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتا ہے تاکہ زندگی فساد اور آلودگیوں سے محفوظ رہ کر ارتقاء پذیر ہو۔

قدر کے معنی ہیں اندازہ یا پیمانہ۔ کسی چیز کو خلق کرنے اور اس میں توازن و تناسب قائم رکھنے کو تقدیر کہتے ہیں۔ ہر شے کا پیدا کرنے والا وہ ہے اور اسی نے ان کی تقدیر مقرر کر رکھی ہے (۲۵/۲)۔ اس کے پاس ہر چیز کے لا انتہا خزانے ہیں جن کو وہ اپنی اپنی قدر کے مطابق نازل کرتا ہے۔ (۱۵/۲۱)۔

زیست میں ہر شے، انسان کے سوا، اپنی خصوصیت (التقدیر) لئے موجود ہے۔ اور ان کی حرکات سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ بھی تقدیر کے مطابق ہوتے ہیں۔ کائنات کا سارا نظم قدرت کے قواعد و قوانین کے تحت چل رہا ہے اور ہر حرکت کا نتیجہ بھی اسی قانونِ مکافاتِ عمل کے تحت برآمد ہوتا ہے۔ قانونِ مکافاتِ عمل اٹل ہے۔ (۹۹/۷-۸، ۳/۱۴۴، ۳۵/۱۱)

آگ میں روشنی، حرارت اور جلانا اس کی تقدیر ہے۔ انسان سردی میں اس کی حرارت سے سکون حاصل کرتا ہے۔ اس پر کھانا پکاتا ہے۔ اندھیرے میں اجالا کرتا ہے اور کئی دیگر تعمیری کام اس سے لیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر

انسان آگ سے تخریبی کام لینا چاہے تو کسی کو جھلس سکتا ہے۔ جلا کر راکھ کر سکتا ہے۔ انتہا کر سکتا ہے اور چاہے تو ساری دنیا کو اس میں جھونک سکتا ہے۔ آگ پابند تقدیر خود ہے۔ اور آگ دو چیزوں کی رگڑ سے پیدا ہوتی ہے یعنی آگ کا رگڑ سے پیدا ہونا بھی تقدیر ہے اور یہ ایسی تقدیر ہے کہ جس کی اللہ نے قسم کھائی ہے۔ ([illegible])۔

دراصل جہاں تک انسانی زندگی کا تعلق ہے اشیاء کی تقدیر ممکنات کی دنیا میں ایک جامد حقیقت ہے جو انسان کی حرکت سے خیر یا شر کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ورنہ کوئی شے بذات خود نہ اچھی ہے نہ بری ہے۔ اشیاء میں تغیر ان کی خصوصیت پائی جاتی ہیں۔

حادثے، بیماریاں، بے وقت اموات، قتل و خون، ظلم، فساد اور آلودگیاں انسان کی ذہنی غفلت، کوتاہی، کم علمی، سرکشی اور نفس پرستی کی بناء پر رونما ہوتی ہیں۔ اور اس حقیقت کا احساس اس کے تحت الشعور میں موجود ہے ورنہ ان کے سدباب اور علاج کی تدبیریں نہ کرتا۔ اور اگر یہ سب کچھ مقدر ہے تو کوئی انسان مجرم یا سزاوار نہیں ہے۔

ہدایات وحی ایسی ہیں جن کو غور کے ساتھ پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی اور تقدیر کا غلط مفہوم اخذ کر لیا جاتا ہے۔

غور فرمائیے!

اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور گمراہ نہیں کرتا مگر بدکرداروں کو جو عہد باندھ کر (اللہ سے) توڑ دیتے ہیں اور وحدت کی بجائے تفرقہ و انتشار پیدا کر کے موجب فساد ہوتے ہیں (۲/۲۶، ۲۷)

حق تعالیٰ اس کو [illegible] جو خود اس سے رجوع [illegible] (۴۲/۱۳ [illegible])

قیامت و احتساب

قرآن نے اللہ اور اس کے ساتھ آخرت پر ایمان لانے کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ (۲:۱۷۷)۔ (ایمان وہی درست ہے جو وحی کے مطابق ہو)

آخرت پر ایمان سے مطلب ہے تسلسل حیات کا یقین یعنی اس حقیقت کو تسلیم کر کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتار لینا کہ موت کے بعد پھر زندگی ہے جس میں موجودہ زندگی کے اعمال کا محاسبہ ہوگا اور کاروان حیات رواں دواں رہے گا۔

احتساب عمل ایک فطری امر ہے۔ جس کی منطقی توجیہ بنا آخرت یا قیامت یا یوم حساب کو بتلا دیا جاتا ہے۔

انسان کے فعال ہونے کا جذبہ محض فعل کے نتیجے کی توقع کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ اور تجربہ یا مشاہدہ اسے خوف اور لالچ سے ہمکنار رکھتا ہے۔ عمل کے نتیجہ کا خوف یا لالچ نہ ہو تو انسانی زندگی جامد ہو کر رہ جائے۔ انسان فعال اس لئے بنتا ہے کہ اس کی محنت کا حاصل اس کی ضروریات پوری کرے گا اور نتیجے میں ذوق و لذت ہوگا۔ دوسری طرف خائف بھی رہتا ہے کہ کہیں اس کی محنت کا نتیجہ منفی ہو کر باعث محرومی و اذیت نہ ہو۔

ان حقائق سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہر عمل نتیجہ خیز ہوتا ہے مثبت صورت میں ہو یا منفی صورت میں۔ اور اس فعل کا نتیجہ انسان کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا۔

عمل کا نتیجہ دو صورت سے برآمد ہو کر اثر انداز ہوتا ہے ایک مادی صورت

کا رسولؐ بری الذمہ ہے۔ مگر جان لو کہ مقصدِ تخلیق اس رازق و قوی الٰہِ حقیقی ـــــ اللہ کی عبودیت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ مفادِ عاجلہ میں بے تحمل ہو کر خود پر ظلم نہ کرو۔ یقین کر لو کہ روزِ حساب معیّن ہے جس روز ظالمین جہنم میں دھکیل دیئے جائیں گے (۵۱ / ۶۰-۲۳)

طور کی قسم۔ کتابِ مسطور کی قسم۔ اورَاقِ منشور کی قسم۔ بیت المعمور کی قسم۔ بلندیوں کی قسم۔ گہرائیوں کی قسم۔ روزِ محشر ایک سنجیدہ حقیقت ہے جسے باطل میں مسحور ہو کر لوگ مذاق سمجھ کر ہنسی میں اڑا دیتے ہیں۔ جب عذابِ نار میں داخل ہوں گے تو دیکھ لیں گے کہ جس وحی کو وہ دروغ و سحر اور شاعری سمجھتے تھے وہ سچ نکلا۔ اس وقت ان کے لیئے صبر کرنا یا نہ کرنا برابر ہوگا اس لیئے کہ وہ دنیا کی زندگی میں متنبہ نہ ہوئے۔ اور جو حق شناس صبر و تحمل سے اپنے فرائض پورے کرتے رہے اور دعائیں مانگتے رہے وہ اپنے پختہ ایمان اور نیک اعمال کے صلے میں نعمت جنت پا کر خوش و خوشحال ہوں گے۔ (۵۲ / ۱-۳۲)

یقین جانو کہ وہ گھڑی آنے والی ہے۔ جو کسی کو پست اور کسی کو بلند کر دے گی۔ ایک جھٹکے سے زمین لرز جائے گی۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر غبار کی مانند اڑنے لگیں گے اور لوگ تین قسموں میں بٹ جائیں گے۔ کچھ دائیں طرف والے ہوں گے بیشتر تعداد بائیں طرف والوں کی ہوگی اور قلیل تعداد میں پیش پیش ہوں گے جو نیکیوں میں آگے بڑھنے والے ہیں جن کا مقام جنت میں بلند ترین ہوگا۔ انھیں قربِ الٰہی حاصل ہوگا۔ ان میں زیادہ اگلے وقتوں کے لوگ اور تھوڑے ہوں گے پچھلے وقتوں کے لوگ ـــــ دائیں طرف والوں کا مقام بھی درجہ بدرجہ جنت میں ہوگا اور ان میں بہت سے اگلے وقتوں کے لوگ ہوں گے اور بہت سے پچھلے وقتوں کے لوگ ہوں گے۔ لیکن افسوس کہ بائیں طرف والوں کا مقام جہنم ہوگا اور وہ بڑے مسرور رہتے

اپنی داستانِ حیات سنے گا تصویرِ حیات اپنی آنکھوں سے دیکھے گا اور خود اپنے خلاف گواہ ہوگا اور کوئی عذر نہ چل سکے گا۔ (۷۵ / ۱-۱۵)۔

کاش! کہ انسان نے دنیا کی لذتوں میں محو ہوکر آخرت کو نہ بھلایا ہوتا۔ کاش! کہ وہ لذتِ حق سے آشنا ہوتا۔ آشنائے خودی و خدا ہوتا۔ پھر نہ موت سے خائف ہوتا نہ ذلت آمیز حیلے اختیار کرتا۔ بلکہ اپنے اللہ کی طرف لوٹ جانے میں شاداں ہوتا۔ لیکن افسوس! ناعاقبت اندیش زندگی میں حق کو جھٹلاتا رہا تکبر کرتا رہا اور اپنی صلوٰۃ سے غافل رہا۔ (۷۵ / ۲۰-۴۰)۔

انسان نہیں سوچتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ ایک وقت تھا کہ وہ قابلِ ذکر شے نہ تھا۔ نطفۂ مخلوط سے اس نے جنم لیا اور سننے دیکھنے والا بن گیا۔ پھر اسے حق و باطل دونوں راستے دکھا دیئے گئے اور ان میں سے ایک کو قبول کرنے کا اختیار دے دیا گیا اور اُسے بتا دیا گیا کہ راہِ باطل اختیار کرنے کا انجام جہنمی زندگی ہے اور راہِ حق اختیار کرنے کا انجام جنتی زندگی ہے۔ سو جس نے دنیا کی زندگی کو قدر جانا وہ اپنا انجام پائے گا اور جس نے دن رات احکامِ الٰہی کی تعمیل میں بسر کیے وہ اپنا صلہ پائے گا۔ (۷۶ / ۱-۲۲)۔

ان ہواؤں کی قسم جو خراماں خراماں چلتی ہیں پھر تند و تیز ہوکر بادلوں کو پھاڑ دیتی ہیں جس سے زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے اور ان ملائکہ کی قسم جو وحی لانے والے ہیں جس وحی میں مانع اور خوف کا پیغام ہے اور جو جھٹلائے گا اُس کے لیے بڑی خرابی ہے۔ (۷۷ / ۱-۱۵)۔

جس نے دل سے سرکشی کی اور اپنے جذبات و خواہشات کے پیچھے چلا وہ جہنم میں جائے گا۔ جو اللہ اور آخرت پر ایمان لایا اور رب سے ڈرتے ہوئے احکامِ الٰہی کی تعمیل کرتا رہا وہ جنت میں جائے گا۔ کوئی نہیں جانتا کہ روزِ قیامت کب آئے گا

اور جب آئے گی تو انسان اس طرح محسوس کرے گا کہ وہ دنیا میں صرف ایک شام یا صبح ٹھہرا ہے! (۷۹/۴۲-۴۶)۔

اس گھڑی سے ڈراتے رہو نہ کہ جب سورج لپیٹ لیا جائے گا تارے بے نور ہو جائیں گے پہاڑ چلائے جائیں گے بیانے والیاں بے کار ہو جائیں گی۔ درندے جمع کیے جائیں گے سمندر آگ ہو جائیں گے۔ روحیں ملا دی جائیں گی۔ زندہ درگور ہونے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے عوض ماری گئی۔ آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی ادھر ایک طرف آگ بھڑکا دی جائے گی اور دوسری طرف جنت قریب لائی جائے گی۔ دفتر کھول دیے جائیں گے تب ہر شخص معلوم کر لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔ (۸۱/۱-۱۴)۔

اجرام فلکی کی قسم جو نمودار ہو کر غائب ہو جاتے ہیں۔ شب کی قسم صبح کی قسم یہ قرآن پیغامبر عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے جو صاحب قوت ہے اور مالک عرش کے ہاں بلند رتبے والا ہے۔ سردار ہے امانتدار ہے۔ اور تمہارا رفیق دیوانہ نہیں جس نے اسے افق کے کنارے پر دیکھا اور راز حیات پا کر بخیل نہیں بنا۔ اسے وحی کے ذریعے جو علم ہوا بیان کر دیا۔ اور یہ وحی کلام الٰہی ہے۔ شیطان مردود کا کلام نہیں ہے۔ تو پھر تم کیوں بہکے پھرتے ہو۔ یہ تو تمام جہان کے لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔ جو چاہے اس پر عمل کر کے سیدھا راستہ اختیار کرے۔ تو گویا تم وہی کچھ چاہ سکتے ہو جو اللہ چاہتا ہے! (۸۱/۱۵-۲۹)۔

کیا تم چاہتے ہو کہ جب آسمان پھٹ جائے تارے منتشر ہو جائیں سمندر بہہ نکلیں قبریں الٹ جائیں اور اس وقت تمہیں معلوم ہو کہ تم نے آگے کیا بھیجی ہے اور پیچھے کیا چھوڑا ہے؟ نہ جانے انسان اپنے رب کریم کے بارے میں کیوں فریب خوردہ ہے حالانکہ وہی اس کا خالق ہے جس نے اسے متوازن بدن و دلکش صورت بخشی ہے۔

آفتاب کی قسم۔ مہتاب کی قسم۔ ارض و سمٰوٰت کی قسم۔ خالقِ ارض و سمٰوٰت کی قسم۔ خالق و مخلوق کی قسم وحی نے انسان کو خیر و شر کے راستے واضح طور پر دکھا دیئے ہیں۔ وہ چاہے تو تزکیۂ نفس سے بلند مقامات حاصل کرلے اور چاہے تو نفس کو خاک میں ملا دے (۹۱/۱۰-۱)۔

تم لوگوں کی کوشش طرح طرح کی ہیں مگر کوشش اس کی بارآور ہوگی اور راہِ حیات آسان ہوگی جو نیک سیرت و بلند کردار ہے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اور اس کی کوشش رائگاں جائے گی اور راہِ حیات دشوار ہوگی جو بخل کو حق سمجھ کر گمراہ ہوا اور غنی ہو کر بخیل بنا۔ (۹۲/۱۰-۴)۔

ذہن نشین کرلو کہ روزِ قیامت ہر شخص سے پورا پورا حساب لیا جائے گا۔ جس نے ذرہ بھر اچھائی کی ہوگی اس کا صلہ پائے گا جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی اس کا صلہ پائے گا (۹۹/۸-۱)۔

انسان اپنے رب کا بڑا احسان ناآشناس ثابت ہوا ہے۔ دنیا کے لیے اس طرح دیوانہ وار پھرتا ہے کہ جیسے موت کے بعد اس نے کوئی حساب نہیں دینا۔ نہیں جانتا کہ اللہ سے اس کی کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی وہ دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے۔ (۱۰۰/۱۱-۱)

لوگ دنیا کی طلب و ہوس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دوڑ میں مصروف رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ قبروں تک جا پہنچتے ہیں۔ اور نہیں سوچتے کہ جن نعمتوں کو حاصل کرنے میں زندگی گنوا دیتے ہیں ان کے بارے میں پرسش ہوگی۔ (۱۰۲/۸-۱)۔

وہ منافع خور در اصل خسارے میں ہیں جو ایک دوسرے پر طعن آمیز اشارے کرنے والے ہیں اور عیب جو ہیں۔ ان کی کمائی مال سمیٹنا اور اسے گن گن کر رکھنا

جایا کرے گی کہ ——— اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے۔ اس کی ذات احد و بے نیاز ہے۔ وہ خود بخود ہے جس کا کوئی ہمسر نہیں (۱۱۲/۱-۴)۔ جس کی وحی کی تعمیل کیے بغیر انسانیت کسی برائی سے نہیں بچ سکتی ——— نہ زندگی کی تاریکیوں اور سحر کاریوں سے نہ حاسدوں کے حسد سے (۱۱۳/۱-۵) اور نہ شیطانی وسوسوں سے بچ سکتی ہے۔ وہی ہے النّاس کا پروردگار، النّاس کا شہنشاہ اور النّاس کا اِلٰہ حقیقی جس کی پناہ میں آئے بغیر فلاح ممکن نہیں ہے (۱۱۴/۱-۶)

مرا ز روزِ قیامت غمے کہ ہست این است
کہ روئے مردمِ عالم دوبارہ باید دید

تبریزی
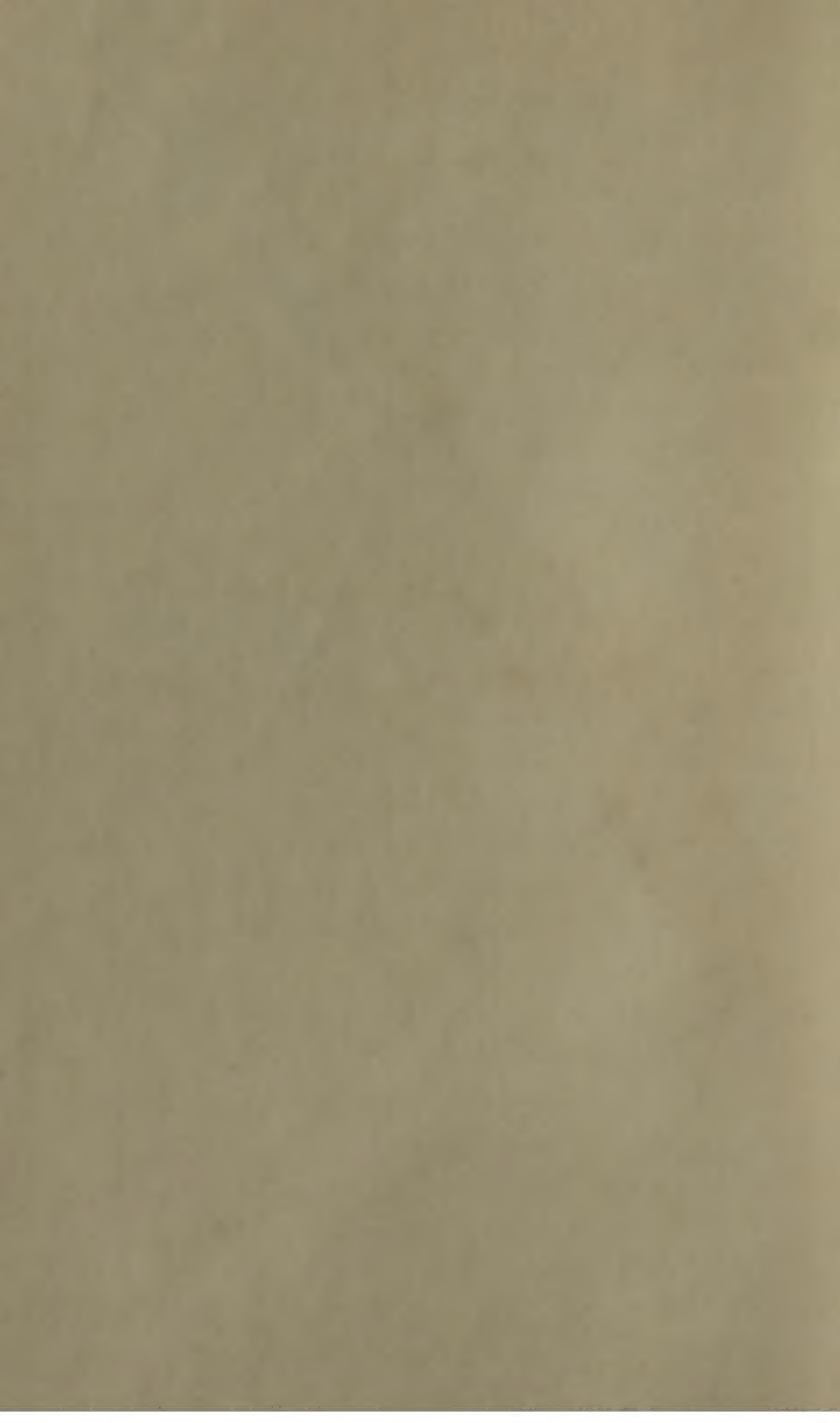
صفحہ		سطر	غلط	صحیح
۴		۱۴	گوارہ	گوارا
۸		۱۶	معنّی	معنیٰ
۲۰		۱۲	محنّت	محنت
۲۱		۱۴	اخوت . . حدت	اخوت ووحدت
۲۳		۴	مزحقہ	مضحکہ
۲۹		۱۴،۵	میخانہ	بتخانہ
۴۸		۱۳	بارے بتایا جائے	بارے میں بتایا جائے
۴۹		۱۲	ماجرہ	ماجرا
۵۰		۳	گذشتہ	گزشتہ
۵۱		۱۷	بو	لو
۶۱		۱۳	روز	زور
۶۲		۵	سے آؤ ہو	سے آئے ہو
۶۵		۸	گرہوں	گروہوں
۷۷		۱	انداز	اندازہ
۹۳		۱۷	پہچانا	پہچانا
۱۰۹		۶	تغنیر، ونما	تغیر ونما
۱۱۹		۴	کھتیاں	کھیتیاں
۱۲۲		۱۰	ا قوتوں	قوتوں
۱۲۵		۱۴	سکے	سکیے
۱۲۹		۱۸	موقع دے	موقع نہ دے
۱۳۰		۱	لکاح	نکاح
۱۴۲		۱۱	محنّت	محنت
۱۴۳		۳	غو، فکر	غور و فکر
۱۴۹		۳	دلیری	دلبری
۱۷۸		۴	مطلب، برآوری	طلب، برآری
۱۸۵		۱	تدبیر اور سوچ بچار کرے	تدبر اور سوچ بچار کرنے
۲۰۱		۱	محنّت	محنت